جامعہ مدنیہ لاہور کا علمی، ادبی اور اصلاحی مجلہ

نگرانِ اعلیٰ :

حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

ماہنامہ
انوارِ مدینہ
لاہور

جلد : ۲
شمارہ : ۱۱
—: قیمت :—
۶۵ پیسے

ربیع الاول ۱۳۹۲ھ
مئی ۱۹۷۲ء
—: فون :—
۶۲۹۳۲

مدیر اعزازی : پروفیسر یوسف سلیم چشتی
مدیر معاون : حبیب الرحمٰن اشرف

اس شمارے میں

اداریہ	----------	۲
سیرۃ نبوی اور مستشرقین	حضرت مولانا شمس الحق افغانی مدظلہ	۴
اُولٰئِکَ ھُمُ الرَّاشِدُوْن	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہ	۱۷
نعت	جناب احسان دانش	۳۱
دُعا کی افادیت و اہمیت	حضرت مولانا محمد اجمل مدظلہ	۳۳
نعت - و - غزل	گوہر ہوشیار پوری - و - محمود احمد عارف	۴۰
الشفاء الخ	محترم نور محمد صاحب غفاری ایم اے	۴۱
ابلیس کے دوست اور دشمن	مولانا محمد یوسف فیروز پوری	۵۵

بدل اشتراک : سالانہ سات روپے   طلبہ کیلئے پانچ روپے   فی پرچہ ۶۵ پیسے

سید حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ طابع و ناشر نے مکتبۂ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ انوار مدینہ، جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جب آپؐ تشریف لائے....

"ربیع الاوّل" وہ مبارک مہینہ ہے، جس میں ایک ایسے رسولِ پاک کی ولادت باسعادت ہُوئی جو ہر طرح کی خوبیوں اور ہمہ قسم اعلےٰ ترین صفات و کمالات سے آراستہ تھے، جنہیں ایسی کامل و اکمل کتاب "قرآن مجید" ملی جس کی نظیر کہیں بھی ملنی ممکن نہیں۔ اس کتاب مقدس کے سامنے چیلنج کے باوجود نہ صرف اس کے مخالف اور موافق عرب فصحاء و بلغاء نے ہتھیار ڈال دیئے بلکہ تمام مخلوقات نے اس کی فصاحت و بلاغت کے آگے جبینِ عجز جھکا دی۔

جن کی غلامی پر آسمانوں کے فرشتے اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ ناز کرتے ہیں۔ جن کی ذاتِ اقدس پر رسالت و نبوت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی، جو سراپا شفقت و رحمۃ تھے۔ جنہوں نے اپنے بدترین دشمنوں کو ان کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اٹھا کر بھی دعاء ہی دی اور جن کی اطاعت و پیروی دنیا و آخرت میں فوز و فلاح کی ضامن ہے۔

جنہوں نے انسانوں کو ان کے صحیح مقام و مرتبہ سے روشناس کرایا اور انہیں سمجھایا کہ بُتوں کی پوجا پاٹ سے باز آجاؤ آگ اور درختوں کے سامنے سر نہ جھکاؤ۔ ان چیزوں کو اپنا آقا اور خدا نہ سمجھو! یہ چیزیں تمہاری خدمت کے لیے پیدا فرمائی گئی ہیں نہ اس لیے کہ تم انہیں مخدوم اور اپنا آقا تصور کرو۔ تمہارا آقا اور تمہارا معبود صرف وہی ایک ہے۔ جس نے اس پُوری کائنات کو وجود بخشا ہے اور جس نے انسانوں کو تمام چیزوں پر شرف و برتری عطاء فرمائی ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ اور ہم نے فضیلت دی بنی آدم کو)

یہ مبارک مہینہ اس حکیم و مصلح اعظم کی ولادت کا ہے کہ جب وہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ ہر بڑا اور خوبصورت پتھر انسانوں کا معبود سمجھا جاتا تھا۔ جھوٹ، مکر و فریب ایسے بُرے خصائل اس معاشرہ میں بدرجۂ اتم موجود تھے، بدنظمی، انتشار لوٹ مار اور لاقانونیت کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ جنگ و جدل لوگوں کا معمول بن چکا تھا۔ انسانیت اور شرافت کا کہیں نام و نشان نہیں رہا تھا۔ بربریت اور درندگی عام تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا۔

لیکن جب وہ حکیم کائنات مبعوث فرمائے گئے اور انہوں نے دنیا کو ہدایت و تبلیغ فرمائی تو تھوڑے ہی عرصہ میں ایک

عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا۔

جن کے سر کل تک ہر پتھر کے سامنے خم تھے۔ اب وہ اپنے خالق اور معبودِ حقیقی کے سوا کسی کو بھی اس لائق نہیں سمجھتے ہیں کہ اس کے سامنے سر جھکایا جائے۔

جو لوگ کبھی خدائے بزرگ و برتر کا نام سننا تک گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ آج اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور اس کے نہ ماننے والوں سے (خواہ وہ ان کے ماں باپ، بہن بھائی یا دوسرے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں) قطع تعلق کیے ہُوتے ہیں۔

جو پہلے لوٹ مار کو باعثِ فخر سمجھتے تھے آج نہ صرف یہ کہ لوٹ مار سے کنارہ کش ہیں بلکہ بے بس و مجبور لوگوں کے محافظ و نگہبان بنے ہُوئے ہیں۔

جو کسی زمانے میں جہالت کی بناء پر معمولی سے معمولی بات پر بھی قتل و غارت گری پر اُتر آتے تھے۔ آج وہ بڑی سے بڑی بات کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

مختصر یہ کہ حضور رحمۃ للعلمین صلے اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیم نے دنیا کو ضلالت و گمرہی کے عمیق غار سے نکالکر انسانیت و شرافت کے مقام بلند پر فائز کیا۔ معاشرہ میں موجود ان گنت خرابیوں کا صفایا کر دیا اور ایک بدترین معاشرے کو ایک بے نظیر اور قابلِ تقلید معاشرے میں بدل دیا۔

آیئے! اس رسول مقبولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا شعار اور انکی پاکیزہ زندگی کو نمونۂ عمل بنالیں کہ اسی میں ہماری کامیابی و سرفرازی مضمر ہے۔ آج بھی ہمارا بگڑا ہوا معاشرہ انہی کی تعلیمات کی بدُولت درست کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا رہنا ہی ہماری خرابیوں کے خاتمے کا موجب اور ہماری تمام مصیبتوں کا مداوٰی بن سکتا ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ صدر مملکت نے مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کر دیا۔ آئین سازی کے کام کے لیے پچیس حضرات کی کمیٹی بھی بنادی گئی اور اس میں سب جماعتوں کے نمائندے بھی لے لیے گئے۔ خدا کرے ایسا آئین مرتّب ہو جاتے اور بروئے کار آجائے جو اسلامی ہُو تاکہ ہماری پوری مملکت سکون و اطمینان کا گہوارہ اور رحمت خداوندی کا مظہر بن جائے۔

اشرف

۲ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ

سیرۃ نبوی اور مستشرقین

شیخ التفسیر حضرۃ علامہ مولانا شمس الحق افغانی مدظلہم

کسی عظیم شخصیت کے متعلق تین امور ایک منصف مزاج محقق کی نگاہ میں قابلِ توجہ ہیں:

(۱) تاریخی تعارف (۲) ذاتی کردار (۳) اس کے دائرۂ کار سے متعلق کارنامے۔

پہلی چیز یعنی تاریخی تعارف

تو اقوامِ عالم میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قبل جس قدر پیشوایانِ دین اور ہادیانِ ملّت اور انبیا علیہم السّلام گذرے ہیں، ان کے تاریخی تعارف کے متعلق ان کی وفات سے لے کر اب تک یقینی طور پر اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں، جو بائیبل میں ان کے متعلق مختصر تذکرہ درج ہے اور وہ عدمِ محفوظیت اور تحریفات کی وجہ سے ان کی عظمتِ شان کے خلاف ہے۔ مثلاً حضرت نوح ؑ کے متعلق کتابِ پیدائش باب ۹ آیت ۲۱ میں ہے "نوح نے شراب پی اور ننگا ہوگیا"۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق کتابِ پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۰ تا اختتامِ باب میں مذکور ہے، "لُوط نے شراب پی اور اپنی صاحبزادیوں سے ہم بستر ہوا، وہ حاملہ ہوئیں اور ان سے اولاد پیدا ہوئی" انجیل متی باب ۲۶ میں ہے کہ "یہودا حواری نے تیس روپے رشوت لے کر مسیح کو گرفتار کرایا"۔

بائیبل کے ان حوالجات سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس میں جو تھوڑا بہت تذکرہ موجود ہے، وہ بھی پراز اغلاط اور ناقابلِ اعتبار ہے، جو یہود اور نصاریٰ کے مذہب کی بنیادی کتاب ہے، باقی ان حضرات کے متعلق ان کے قریب زمانے میں کوئی مستند سوانح یا لائف سند کے ساتھ تحریر نہیں کی گئی، اس کے برخلاف حضور علیہ السّلام کی ذات وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخی تعارف کے اعتبار سے یکتا ہے، ان کی پیدائش، بچپن کے حالات اور زندگی کے کل واقعات سند کے ساتھ موجود

ہیں، ان کی تعلیمات اور ملفوظات کا ایک ایک حرف مستند طریقے پر کتبِ حدیث و سیر میں موجود (درج) ہے۔ اور آج بھی اگر کوئی شخص آپ کی زندگی کا کوئی واقعہ معلوم کرنا چاہے تو معلوم کر سکتا ہے، گویا حضور علیہ السّلام آسمانی تاریخ کے ایک آفتابِ عالم تاب ہیں، جس میں آپ کی ذات کا ہر خد و خال نمایاں ہے، آپ کی زندگی کے حالات میں مختلف زبانوں میں مسلم و غیر مسلم مصنّفین نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں، آج تک کسی شخصیت کے متعلق اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں۔

احادیث

آپ کے ملفوظاتِ دینی یعنی احادیث دس لاکھ سے زائد تحریریں آچکی ہیں اور ان کے حفاظ بھی موجود تھے، جن کو یہ ملفوظات زبانی یاد تھے،

امام احمد حنبلؒ دس لاکھ احادیث اور امام ابو زرعہ سات لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔ قسطلانی نے فلاس سے نقل کیا ہے کہ جو حدیث امام بخاریؒ کو معلوم نہ ہو، وہ حدیث نہیں، یعنی آپ کو حضور علیہ السّلام کی تمام احادیث اور ملفوظاتِ دینی یاد تھے۔

صحابہؓ

جن اہلِ ایمان نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی صحبت پائی ہے، یعنی آپؐ کے دوست اور صحابہ تھے، ان میں سے تقریباً بارہ ہزار کے احوال تاریخ میں قلمبند ہیں،

کیا ایسی شخصیت دنیا اور خاص کر ایسے ملک میں جو اُمیّین اور ناخواندوں کا ملک ہو، کوئی بتا سکتا ہے کہ ان کی احادیث یعنی باتیں کروڑوں انسانوں کے لیے قانونِ زندگی کی حیثیت رکھتی ہوں اور دس لاکھ کی تعداد میں قلمبند ہوں اور صدیوں تک یہی تعداد مختلف محدثین کے سینوں میں محفوظ ہو اور بارہ ہزار دوستوں کے احوال بھی صحیح سند کے ساتھ اور مستند طریقے سے ضبطِ تحریر میں آچکے ہوں اس سے بڑھ کر تاریخی تعارف کسی دُوسرے انسان کو تاریخی دَور کے کسی حصّے میں حاصل نہیں ہُوا ہے۔

دوسری چیز یعنی ذاتی کردار

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا عمل چونکہ اُمّتِ محمدیہ بلکہ کل اقوامِ بشریہ کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ انسانیتِ کاملہ تھا۔ اس لیے دستِ قدرت نے سنّتِ نبوی کی شکل میں اور اُمّتِ محمدیہ صالحہ کے اعمال کی صُورت میں اس کو محفوظ رکھا، تاکہ قیامت تک اگر کوئی انسان کامل بن جانے کی کوشش کرنے کا خواہاں ہو تو اس نمونہ کو سنت نبویہ سے حاصل کر سکتا ہے، اسوۂ نبوی یا محمدی اس قدر ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے کہ اس کا احاطہ ناممکن ہے، لیکن ہم صرف ان میں سے چند امور جن کو دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں

بیان کرنے پر اکتفار کرتے ہیں۔ انسان بہیمیت اور ملکیت کا مجموعہ ہے، بہیمیت تین صفات کو پیدا کرتی ہے۔ (۱) جوشِ نفس یعنی خواہشات (۲) قہر و غضب (۳) تکبّر و پندار۔ یہ تینوں اگر ملکیت کے تابع ہو جاتے ہیں، تو تین کمالات بالترتیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ ۱۔ جوشِ نفس تابع ملکیت ہو کر، عفت، پاکدامنی و قناعت اور پرہیزگاری میں تبدیل ہو جاتا ہے، قہر و غضب، شجاعت میں بدل جاتے ہیں، تکبّر و پندار تواضع کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور انسانیت کمال کو پہنچ جاتی ہے،

ملکیت کے تابع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ تینوں بہیمی طاقتیں رضائے الٰہی کے ماتحت آجاتی ہیں، خواہش نفس محل رضاء الٰہی میں استعمال ہوتی ہے، مثلاً نکاح۔ اور جہاں اللہ کی رضاء نہ ہو بلکہ غضب ہو، وہاں استعمال نہیں ہوتی مثلاً زنا وغیرہ، اسی طرح خواہش حلال کھانے اور کمانے میں استعمال ہوتی ہے، حرام کھانے اور حرام کمانے، مثلاً سُود، ظلم، غضب، چوری، رشوت اور دھوکہ وغیرہ میں استعمال نہیں ہوتی،

قہر و غضب، حفاظتِ خود اختیاری یا حفاظتِ حقوق مظلومین و حفاظت حقوقِ الٰہیہ میں استعمال ہوتا ہے، اور اس کے خلاف مثلاً انسانوں پر ظلم اور ناحق میں استعمال نہیں ہوتا، یہی بہادری و شجاعت کہلاتی ہے، باقی درندگی ہے،

ملکیت کا اثر تقویٰ خشیۃ اللہ اور خوفِ آخرت ہے، جس سے محاسبۂ نفس، علم و معرفت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں کہ یہ اوصاف انسان ہی کے مخصوص کمالات ہیں، ان کمالاتِ چہارگانہ کے تحت ہم سیرتِ نبویہ پر بحث کرتے ہیں۔

(۱) عفت و قناعت

یہ دو وصف حضور علیہ السلام کے ایسے ہیں کہ دوست، دشمن اقراری ہیں کہ آپ نے بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر تک یعنی قریباً ۵۳ سال کی زندگی اپنے دشمنوں یعنی کفار مکّہ اور قریش میں گذاری، جہاں نہ کوئی حکومت موجود تھی۔ نہ قانون اور پورا ماحول سیاہ کارانہ تھا اور اس کو عیب بھی نہ سمجھا جاتا تھا، زنا، شراب اور سُود خواری عام تھی، ان ہی لوگوں میں رہ کر آپ کو خلعتِ نبوّت سے نوازا گیا اور پوری سوسائٹی دشمن بن گئی اور آپ کے قتل کے درپئے ہو گئے، لیکن ان دشمنوں کی زبان سے بھی ایک لفظ آپ کی ذات کے متعلق نہ نکل سکا، جو آپ کی پاکدامنی، عفت، قناعت اور امانت کے خلاف ہو، بلکہ آپ کو اپنے جھگڑوں کا حَکَم مان کر آپ سے فیصلہ کراتے تھے اور "امین" کے لقب سے مشہور تھے، یعنی آپ وہ ذات ہیں کہ آپ سے ہر کسی کی جان، مال اور عزّت باامن اور محفوظ ہے، بلکہ بعد از ہجرت آپ کے اس وقت کے بدترین دشمن ابوسفیان سے

ہرکلیس شاہِ رُوم نے پوچھا: ھل کنتم تتھمونہ بالکذب قبل ان یقول ما قال کیا تم ان پر جھوٹ کا گمان و تہمت کا خیال کرتے رہے ہو، دعوٰیٔ نبوّت سے پہلے۔ قال لا۔ جواباً ابوسفیان نے کہا کہ "نہیں"۔ آپ کی کفار میں بھی سچّائی کی اس شہرت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا — اور کفار نے جو قرآن کے دشمن تھے، سُن کر اس کا انکار نہیں کیا۔ قرآن نے فرمایا انھم لا یکذبونک کہ یہ کفار تم پر جھوٹ کا الزام نہیں دھرتے۔

پچیس سال کے جوشِ جوانی کی زندگی آپ نے تجرّد اور توجّہ حق میں گزاری۔ پھر حضرتِ خدیجہ کی درخواست پر جو چالیس سال کی بوڑھی تھیں، اور جو تین شوہروں سے یکے بعد دیگرے بیوہ ہو چکی تھیں اور دُنیا سے ان کا دل سرد ہو چکا تھا، ایک سردار نے ہزار اُونٹ کے مہر نکاح کی پیشکش کی، لیکن نکاح سے انکار کر دیا، حضرت خدیجہ پاکدامنی کی وجہ سے طاہرہ کے نام سے مشہور تھیں، ان کے "مسیرہ" غلام نے سفر شام کے جو احوال انھیں سُنائے اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل عالمِ تورات و انجیل سے انھوں نے (حضرت خدیجہ نے) جو کچھ آنحضرتؐ کے متعلق سُنا۔ ان سے حضرت خدیجہ کو یقین آگیا کہ آخری نبی آپ ہی ہوں گے، اس لیے از خود نکاح کی درخواست کی اور پچیس سال سے زائد عرصہ آپ نے اسی ایک بوڑھی بیوی کے نکاح پر قناعت کی، اگرچہ جوان عورتوں کی کمی نہ تھی، اس کے بعد بھی جس قدر نکاح حضورؐ نے کئے ہیں، حضرت عائشہ کے سوا وہ سب بیوگان تھیں، جس پر یورپ کے مستشرقین نے اعتراض کیا اور بلا تحقیق جو جی میں آیا لکھدیا،

تعدد ازدواج

چنانچہ مستشرقینِ یورپ نے تعدد نکاح نبوی کو ہدف طعن بنایا۔ اور اس کو نفسانیت کا رنگ دیا — ان کے اس اعتراض کے تین اجزاء ہیں (۱) نفسِ قانونِ تعدد پر اعتراض (۲) نیتِ نبوی پر اعتراض کہ اس نکاح کی محرک ہوائے نفس تھی، (۳) تعداد زوجات امت کے حق میں چار تک ہے، لیکن حضور علیہ السلام نے نو یا گیارہ تک نکاح کئے، اس فرق پر اعتراض۔

قانون تعددِ نکاح پر اعتراض

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا قانون یورپ کے خود ساختہ قانون کا پابند نہیں ہم اس سوال کا جواب دو طرح دیتے ہیں، (۱) نقلی (۲) عقلی

نقلی

یعنی یہود اور نصاریٰ کی مسلّم کتاب بائبل سے۔ پہلا حوالہ ابوالانبیا، حضرت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے، بائبل پیدائش ۱۶/۴ میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں بیک وقت تھیں، سارہ ہاجرہ، قنطورا۔ پیدائش ۲۹/۲۴ میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیک وقت چار بیویاں تھیں، لیّا، زلفہ، راخل

بلکہ ـــــ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بے تعداد زوجات تھیں (یعنی بیویاں تھیں۔ استثنا، ۲۱ / ۱۰-۱۵ -

حضرت داؤد علیہ السّلام کی اُنّیس بیویاں تھیں شمویل ۱۶ / ۲۳

حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار عورتیں تھیں۔ سلاطین ۱۱ / ۳

یہ سب بائیبل کے مُستند پانچ انبیاء علیہم السّلام کی متعدد زوجات کے حوالے ہیں، اگر ان پر مستشرقین کو اعتراض نہیں ہے تو تعدّد نکاح نبوی پر کس مُنہ سے اعتراض کرتے ہیں۔ یہ تو قانونِ تعدد نکاح کی دلیل عیسائیوں کی بائیبل سے دی گئی، اب عقلی دلیل تعدد نکاح کی معلوم کرو اور سُن لو۔

عقلی دلائل

دلیل ؎ : اگر یورپ کے قانون کے مطابق ایک مَرد کے لیے صرف ایک بیوی کے ساتھ نکاح مختص ہوتو پھر قُدرت اور فطرت کے لیے یہ ضروری تھا کہ ولادت میں ذکور و اناث میں مساوات رکھی جاتی یعنی لڑکے اور لڑکیاں کل عالَم میں اور ہر جگہ مساوی تعداد میں پیدا ہوتے، تاکہ لڑکیوں کی تعداد بڑھنے نہ پائے۔ اگر لڑکیوں کی تعدادِ پیدائش لڑکوں سے ایک فی ہزار بھی زائد ہو جاتی، تو تین ارب انسانی آبادی میں ایک لاکھ لڑکوں کی پیدائش کے مقابلے میں ایک لاکھ ایک سو اور ایک کروڑ لڑکوں کے مقابلے میں دس ہزار لڑکیاں زائد ہوں گی۔ اور ایک ارب کے مقابلے میں دس لاکھ عورتیں فالتو ہوں گی، علیٰ ہٰذا القیاس۔ اب سوال ہوگا کہ یہ فالتو عورتیں جنسی فطری خواہش کی تکمیل کے لیے یا خلافِ فطرت تجرّد پر مجبور کی جائیں گی، جو ہر دَور میں اور بالخصوص اس دَور میں ناممکن ہے، یا زنا کے ذریعے ناجائز طریقے سے اپنی خواہش پوری کرینگی، جو انسانی معاشرے کی تباہی کا موجب ہوگا، لہٰذا قانون تعدد نکاح کی صورت میں، جو بشرطِ عدل اسلام میں موجود ہے، ان کی فطری ضرورت کی تکمیل کی قانونی صورت پیدا ہوگی۔ بالخصوص آج کل جو عموماً عورتوں کی تعداد مَردوں سے بہت زیادہ ہے، ان کی کھپت کے لیے اسلام کے فطری قانون تعددِ نکاح کے سوا اور جائز راہ نہیں۔

دلیل ؎ : تعداد اموات میں بھی مرد اور عورتوں کی مساوات قدرت کے لیے ضروری تھی، موت کی صورت میں اگر یک زوجگی کا یورپی قانون، قانونِ فطری اور قدرتی ہوتا تو قدرت کا فرض تھا کہ مَردوں اور عورتوں کی قبض رُوح اور مَوت میں یکسانیت رکھتی، تاکہ توازن پُورا ہو، ورنہ اگر مرد زیادہ مَر جائیں اور عورتیں کم، تو اگر دونوں کی ولادتی تعداد برابر بھی ہو، جب بھی بڑی تعداد عورتوں کی بچ رہے گی، جن کے کھپانے کے لیے یورپی قانون میں جائز صُورت کوئی نہ ہوگی، بہرحال یورپی قانونِ یک زوجگی کے تحت کارخانۂ قدرت کا فرض تھا کہ وُہ شرح پیدائش و اموات کی دفاتر بذریعہ ملائکہ پُورے

پورے ملک اور صوبوں اور ضلعوں تک میں قائم کرتی تاکہ یورپی قانونِ یک زوجگی کا توازن برقرار رہے، لیکن ایسا نہیں ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی قانون منشاء قدرت و فطرت کی ضد ہے اور واجب الترک ہے۔

دلیل ۳ : جنگ بھی فطرتِ انسانی میں داخل ہے۔ انسانی افراد و اقوام قوت شہویہ عزوبیہ (یعنی حب الوطنی) کے تحت فوائد ملک پر قبضہ کرنے کے لیے آلاتِ حرب کے ذریعے دوسرے ملک پر حملہ کرتے ہیں اور جس ملک پر حملہ ہوتا ہے، وہ مدافعت کے لیے جنگ پر مجبور ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دونوں قوموں کی فوجیں قوت غضبیہ کا مظاہرہ کرتی ہیں اور لاکھوں کروڑوں آدمی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں، یا بیکار ہو جاتے ہیں، جنگِ اول میں ایسے مقتولین و بیکار لوگوں کی تعداد چار کروڑ تھی اور جنگِ عظیم ثانی میں چھ کروڑ تعداد تھی، ایسی صورت میں اکثر مرد کام آجاتے ہیں اور عورتیں بچ جاتی ہیں، فوج میں بھرتی اکثر مرد ہیں، عورتیں نہ ہونے کے برابر۔

تو گویا گذشتہ دونوں جنگوں میں جو دس کروڑ مرد ضائع ہوئے، ان کے بالمقابل جو عورتوں کی تعداد بچ گئی۔ اس کو کہاں کھپایا جائے، جائز راستہ تعدد نکاح تو مغربی قانون میں بند ہے، یہ وقت اس صورت میں بھی باقی رہے گی اگر قبل از جنگ مرد اور زن کی تعداد برابر ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ متعدد بیویوں سے بے انصافی ہوتی ہے تو بے انصافی ایک بیوی کے ساتھ بھی کی جاتی ہے، لہٰذا ایک کی بھی بندش ہونی چاہیئے۔

دلیل ۴ : اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلی بیوی بیمار ہوتی ہے اور مرض ممتد ہوتا ہے۔ یا حیض و نفاس کی صورت ہوتی ہے یا بانجھپن ہوتا ہے اور شوہر کو فرزند اور جانشین کی فکر ہوتی ہے، اس صورت میں جنسی جذبہ کی ضرورت بھی اس بیوی سے نہیں پوری ہوتی، کیا ایسی صورت میں عقل کا تقاضا یہ نہیں کہ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے دوسری بیوی نکاح میں لانے کی قانونی گنجائش موجود ہو، یا کہ ان ضرورتوں کو کلیۃً نظرانداز کر دیا جائے، اسلام نے جو دین فطرت ہے، ان سب گذشتہ حالات کو پیشِ نظر رکھ کر بشرط عدل چار بیویوں تک کی اجازت دی، اور سابق اقوام و ادیان کی لاتعداد زوجات کو عدل کی شرط پر چار میں محدود کر دیا۔ یورپ میں آج کل شوہروں کی سپلائی کے لیے انجمنیں قائم ہیں اور عورتیں پریشان پھرتی ہیں لیکن شوہر نایاب ہوتا جا رہا ہے، یہ عقدہ حل ہو جاتا، اگر محمدی قانون پر عمل ہوتا۔ جیسے کہ مسیحی دنیا نے حالات سے مجبور ہو کر مسیحی قانون کو ترک کر کے طلاق میں محمدی قانون پر عمل کر کے مشکلات کو حل کیا اور نبی اُمی کے قانون کی صداقت ماننے پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح امریکہ نے بھی میڈیکل بورڈ کی تحقیقی رپورٹ کے بعد شراب

کی صحتی، نفسیاتی، حیاتیاتی مضرات پر مطلع ہوکر ۱۹۳۷ء میں تحریم و بندشِ شراب کا قانون امریکہ میں نافذ کیا، لیکن وُہ بے لگام معاشرے کو پابند کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اَب قانون تعدد زوجات پر اعتراض کا جواب ختم ہوا۔ اعتراض کا دوسرا جزء کہ "نیت پر اعتراض" اس کا جواب دیا جاتا ہے۔

تعدّد زوجات میں پیغمبر علیہ السّلام کی نیت پر اعتراض اور اس کا جواب

مستشرقین سے مراد وہ یورپی مفکرین ہیں جو علومِ مشرقیہ بالخصوص علوم اسلامیہ کا مطالعہ اس خیال سے کرتے ہیں کہ اپنی تصنیفات کو بنام تحقیق علمی شائع کریں، ایک بات تعصب پر پردہ ڈالنے کی غرض سے قرآن، صاحبِ قرآن اور اسلام کی تعریف میں بھی لکھدی جاتی ہے اور بہت سے اسلامی کتابوں کے حوالے بھی درج کردیئے جاتے ہیں تاکہ مضمون مسلمان ناظرین کی نگاہ میں مقبول ہوجائے، لیکن ساتھ ساتھ ایسی باتیں اور زہر شامل کردیئے جاتے ہیں کہ مسلمان اگر عیسائی نہ ہو تو کم از کم مسلمان بھی نہ رہے، یعنی قرآن اور صاحبِ قرآن علیہ السّلام اور اسلام کے متعلق ان میں تشکک اور تردّد پیدا ہو۔ اور عقیدے کی پختگی زائل ہو۔ یہ شعبہ اسلام کے خلاف مسیحی یورپ کا قلمی جہاد ہے، کیونکہ تلوار کے جہاد سے وہ کامیابی نہیں ہوسکتی جو اس قلمی جہاد سے ہوسکتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود مسلمان برائے نام اسلام کا نام برقرار رکھ کر اسلام کو مٹا دینے کے درپئے ہوجاتے ہیں، یہی نسخۂ اکسیر ہے جو مشرقی پاکستان کے ہندو استادوں اور پروفیسروں نے وہاں سکولوں اور کالجوں میں استعمال کیا اور اظہارِ ہمدردی کے لیے یہ مرچ مصالحہ بھی شامل کیا کہ مغربی پاکستان والے بنگالیوں کو لوٹ رہے ہیں، بنگالیت کے جذبے کو اُبھارا اور اسلامیت سے نفرت دلائی۔ یا بدظن کیا گیا، نتیجہ وُہی ہوا جو ہمارے سامنے ہے، لیکن مغربی پاکستان میں نصابِ تعلیم اور اساتذہ تعلیم پر اب تک تجربے کے بعد بھی ہماری احتسابی نظر صحیح نہیں ہوئی۔ ہم اِن ہی لایعنی جھگڑوں کے شکار ہیں۔ مستشرقین کی یہ ساری دشمنی اسلام سے ہے، نہ دیگر مذاہبِ مشرق سے، یہی حال روسی سوشلزم کا ہے کہ اس کا نشانۂ تیر بھی صرف اسلام ہے، نہ ہندو مذہب، نہ بدھ، نہ مجوسیت نہ مسیحیت۔

اس کی چند وجُوہ ہیں (۱) اسلام کو وہ جاندار مذہب سمجھتے ہیں کہ اگر کسی وقت وہ زندہ ہوا تو بہت بڑی طاقت بن جائے گا، جس کا مقابلہ مشکل ہے۔ (۲) اس میں عالمی مسائل کو حل کرنے کی قوت و کشش موجود ہے، دیگر مذاہب میں نہیں، وہ مذاہب مُردہ ہیں، اس لیے اسلام کے شیر کو مارا تو نہیں جاسکتا، سُلا دینا ضروری ہے (۳) صلیبی جنگوں

سے مسیحی اقوام کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے، جو ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔ ان سب باتوں کے باوجود بعض مستشرقین حضور علیہ السلام کے متعلق بعض غلط بیانیوں کے انکار اور اصل حقیقت کے اقرار کرنے پر مجبور رہیں، مثلاً یہ کہ حضور علیہ السلام نے جو متعدد شادیاں کیں، نفسانی جذبے کی وجہ سے کیں یا دیگر مصالح کی وجہ سے، ہم چند مورخین یورپ کے حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں، جنھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ یہ نکاح نفسانیت کی غرض سے نہیں ہوئے۔

(۱) ڈی۔ ایس۔ مارگولی اسمتھ : یہ بڑا تنگ ظرف اور متعصب نکتہ چین ہے لیکن وہ اپنی کتاب "محمد اینڈ دی رائز آف اسلام" میں لکھتا ہے کہ بہت سے مصنفینِ یورپ کے نزدیک خدیجہ کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی متعدد شادیاں نفسانی خواہشات کے تحت تھیں، مگر وہ اس قسم کی نہ تھیں، کئی شادیاں سیاسی مصلحت کی بنا پر کی گئی تھیں۔ پیغمبر اپنے معتقدین کو اپنے قریب ترین کرنا چاہتے تھے، یہ وجہ ابوبکر(رض) و عمر(رض) کی لڑکیوں عائشہ(رض) و حفصہ(رض) سے شادی کرنے کی تھی، سیاسی مخالفین یا مغلوب دشمنوں کی لڑکیوں سے شادیاں سیاسی مقصد کے تحت دوسری نوعیت کی تھیں۔ باقی شادیوں کی وجہ یہ تھی کہ کوئی لڑکا نہ تھا۔

(۲) آریا سوتھ سمتھ : کے چار لیکچر ۱۸۷۴ء میں جو "محمد اینڈ محمڈنزم" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ کہتا ہے کہ دوسرے مقاصد کے علاوہ محمد کے اکثر و بیشتر شادیوں کے مقاصد بے سہارا افراد پر ترس کھانا تھا، تقریباً سب ہی بیوائیں تھیں، جو نہ خوب صورت تھیں، نہ دولت مند۔ خدیجہ کے وقتِ رحلت تک خود پچاس برس کی عمر کے تھے، ظاہر ہوتا ہے کہ زینب کی کہانی میں رنگ آمیزی کی گئی۔ زینب پیغمبر کی پھوپھی کی بیٹی تھی اور بجائے آزاد غلام سے ان کی شادی کر دینے کے خود ان کے ساتھ شادی کرنے میں رکاوٹ کوئی نہ تھی، جب وہ اور یہ دونوں جوان تھے۔

(۳) ہیروز اینڈ ہیروز ورشپ : میں یورپ کا مشہور مصنف کارلائل لکھتا ہے "محمد(ص) نفس پرست انسان نہ تھے یہ بہت بڑی گمراہی ہوگی کہ اس شخص کو ایک عام بندۂ ہوس تصور کریں، یہ شخص کیف اور حظِ نفس پر گرنے والے نہ تھے، ان کے گھر کا ساز و سامان بادشاہی حاصل ہونے کے باوجود غریبانہ تھا، ان کی خوراک جو کا آٹا اور پانی تھا، اکثر ایسا ہوا کہ مہینوں ان کے گھر آگ نہ جلی، وہ اپنے جوتے آپ گانٹھ لیتے تھے، اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگاتے تھے، ایک غریب، محنتی، مستغنی انسان ان تمام رجحانات سے بے نیاز جن پر عام سطح کے آدمی مرتے رہتے ہیں، اس قسم کا آدمی برا آدمی نہیں ہو سکتا، اس کے جذبات ہوس سے بلند ہوتے ہیں، اگر وہ ایسے ہوتے تو وحشی عرب جو ۲۳ سال اس کے اشاروں پر جان پر کھیلتے رہے اور عمر بھر اُسے

قریب سے دیکھتے رہے، اس کی تعظیم نہ کرتے، وہ بات بات پر کٹ مرنے والے وحشی تھے، ایسے لوگوں سے اپنی اطاعت کرانا کسی عام آدمی کا کام نہ تھا، وُہ انھیں رسول کہتے تھے، اس لیے ان کی ساری زندگی ان کے سامنے بے نقاب تھی. اس میں کوئی راز نہ تھا، سیدھی سادھی زندگی، کبھی وہ ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہیں، کبھی مشاورت میں کہیں ان میں کھڑے ان سے اطاعت کرا رہے ہیں، انھیں انھوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قسم کے انسان ہیں، اس لیے وُہ ان کو پیغمبر کہتے تھے، کوئی شہنشاہ اپنی خلعتِ فاخرہ میں ملبوس ہو کر لوگوں سے اس قسم کی اطاعت نہیں کرا سکتے، جس قسم کی اس انسان نے کرائی.

(۴) لین پول لائف آف محمد میں لکھتے ہیں: یہ کہنا کہ محمد بندۂ ہوس تھے غلط ہے. ان کی روزمرّہ کی زندگی، ان کا تخت بوریا جس پر وہ سوتے تھے، ان کی معمولی غذا۔ کمتر سے کمتر کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا. ظاہر کرتا ہے کہ وہ نفسانی خواہشوں سے بلند و بالا تھے، ان کی متعدد شادیاں ان بیواؤں سے ہوئیں، جن کے شوہروں نے میدانِ جنگ میں اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، وہ محمد کی کشادہ دلی سے اپنی حفاظت و پناہ کا حق رکھتی تھیں، باقی شادیاں مصلحت کی بنا پر کی گئیں. مخالفین کے سرداروں کو مسخر کرنے کیلئے سب سے بڑا سبب بیٹے کی تمنا تھی، جو ان کے قدم بقدم چلے. سب سے پہلا ثبوت ان کی پہلی بیوی خدیجہ کے ساتھ ان کی وفاشعاری ہے کہ شروع سے آخر تک اس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا، ہلکی سی بھی لغزش نہ ہوئی۔ خدیجہ کے بعد اگرچہ انھوں نے متعدد شادیاں کیں، لیکن انھیں کبھی نہ بھولے اور آخر وقت تک یاد رکھا۔ یہ محبت بھری یاد ایک شریف الطبع انسان ہی میں ہو سکتی ہے، نہ ایک بندۂ ہوس میں.

جدید دشمنوں کا اقرار

یہ حوالجات ان مخالفینِ اسلام مورخین یورپ کے ہیں، جو پیغمبر اسلام علیہ السّلام کی زندگی پر سخت سے سخت تر تنقید کے عادی ہیں، انھوں نے بھی تاریخی واقعات سے مجبور ہو کر حضور علیہ السّلام کی ذات کو ہوا و ہوس و عام خواہشات کی دنیا سے بلند مقام عطا کیا، یہ تو جدید دشمنوں کا اقرار ہے.

قدیم دشمنوں کا اقرار

قدیم دشمنان پیغمبر اسلام جن کی تمام کوششیں اور جان و مال کی ساری قربانیاں صرف اس لیے تھیں کہ آپ کو ناکام کر کے لوگوں کی نظروں میں غیر مقبول بنائیں، لیکن ان دشمنوں میں سے کسی ایک دشمن نے بھی حضور علیہ السلام کے متعلق ہوا و ہوس یا خواہش پرستی کا ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔ ورنہ مستشرقین کے لیے صرف وہی حرف نقل کر دینا اثباتِ مقصد کے لیے کافی تھا اور اپنی طرف سے الزام تراشنے کی ضرورت

نہ تھی، اس سلسلے میں بدترین دشمن ابوسفیان اور اس کے قریشی ساتھیوں کا مجمع عام میں وہ بیان جس سے آپ کی عزت مآبی اور امانت داری کا واضح ثبوت ملتا ہے، شہادت کے لیے کافی ہے۔

واقعاتِ تاریخ

خود حضور علیہ السلام کی زندگی خواہشاتِ نفس کی ضد ہے، ہوس اور خواہشِ نفس ناقابلِ تقسیم جذبہ ہے۔ نفس کو مال کی خواہش ہوتی ہے، عمدہ لباس کی خواہش ہوتی ہے، عمدہ مکان کی، عمدہ خوراک کی، مجالس میں عمدہ نشست کی بھی، دشمنوں سے انتقام کی بھی اور بیویوں کی بھی خواہش ہوتی ہے، عمدہ سواروں، راحت و آرام اور مقامِ عزت کی خواہش ہوتی ہے،

ان چیزوں پر اگر منصفانہ نگاہ ڈالی جائے تو عین اس وقت کہ آپ کو عرب کی دس لاکھ مربع میل کی سلطنت پر اقتدار حاصل تھا۔ کسی وقت بھی آپ کے پاس مال نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ نے ایک درہم نہیں چھوڑا، ایک بار نماز سے فارغ ہو کر جلدی سے گھر میں تشریف لے گئے۔ صحابہ حیران تھے کہ کیا بات ہے، واپس آکر آپ نے بتایا کہ گھر میں کچھ مال تھا، اس کو تقسیم کرنے کا حکم فرما آئے ہیں، کیونکہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ موت آئے اور گھر میں مال موجود ہو۔ آپ کا لباس غریب عوام کی طرح تھا، اگر کسی وقت کوئی اچھی چادر یا کپڑا کسی نے پیش کیا اور کسی کو پسند آیا یا مانگا تو فوراً اتار کر دے دیا۔ مکان کیا تھا، مٹی کی چھوٹی چھوٹی دیواروں پر کھجور کی شاخیں ڈال کر اس کے نیچے عمر بھر سوتے رہے، گھر میں چراغ تک نہ تھا، بارش میں چھپر کے اُوپر ٹاٹ ڈالا جاتا تھا، مجالس میں آپ کی مخصوص نشست نہ تھی، عام آدمی جب باہر سے آتا تو پیغمبر اور ان کے جان نثاروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا۔ خوراک کا یہ عالم تھا کہ گھر کی واقف حال بیوی حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ تین تین ماہ تک اس شاہ دوجہاںؐ کے گھر میں آگ نہیں سلگتی تھی، پانی اور چند دانے خرما پر گزارہ تھا، بعض اوقات بھوک سے بے تاب ہو کر پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے کہ بھوک کا احساس نہ ہو۔ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضور کے پورے کنبے کو دو دن مسلسل کبھی پیٹ بھر کر جَو کی روٹی میسر نہیں آئی، یہاں تک کہ حضور وصال فرما گئے۔ دشمنوں سے انتقام کا یہ حال تھا کہ اہلِ مکہ جیسے بدترین دشمنوں کے تیرہ سال کے مظالم سے تنگ آکر آپ نے مکہ جیسے مقدس وطن کو چھوڑا تھا، فتح مکہ کے موقع پر وُہ پابہ زنجیر قیدیوں کی صورت میں جب آپ کے سامنے پیش کیے گئے تو آپ نے فرمایا، تم سب آزاد ہو۔ اور میں تم کو ملامت تک بھی نہیں کرتا۔ کیا اس سے بڑھ کر نفس کشی اور خواہش کو پائمال کرنے کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں مل سکتی ہے سواری کا یہ حال تھا کہ جب اونٹ کم ہوتے تھے اور دو

دو تین تین باری باری سے ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو آپ بھی خود اس میں شامل ہوتے تھے، جب آپ کی نوبت میں رفیقِ سواری عرض کرتا کہ آپ سوار ہو جائیں، میں آپ کے بدلے میں پیدل چلوں گا تو آپ یہ فرما کر سواری سے اتر کر پیادہ چلتے کہ تم مجھ سے قوی نہیں، اور مَیں تم سے اجر و ثواب کی خواہش کم نہیں رکھتا، راحت طلبی نہ تھی، چنانچہ یہ حال تھا کہ اکثر اوقات مشغولیت کے باوجود مکان پر دربان نہ تھا، ہر وقت ہر کوئی مل سکتا تھا دن کو اکثر روزے، رات کو خدا کی عبادت، فوجی سپہ سالار بھی خود۔ چیف جسٹس بھی خود معلم اور استاد بھی خود۔ عزّت اور وقار پرستی نہ تھی چنانچہ یہ کیفیت تھی کہ صحابہؓ کے ہمراہ جب چلتے تھے تو سب سے پیچھے چلتے تھے اور جب مجلس میں آتے تھے تو کوئی صحابی تعظیم کے لیے نہیں اُٹھتا تھا کیونکہ آپ نے منع فرمایا تھا کہ میرے لیے کوئی کھڑا نہ ہو، لہٰذا جان نثار صحابہ تعمیلِ حکم سے مجبور تھے، یہ سب امور ایسے ہیں کہ جس ذات میں رائی کے دانے کے برابر خواہشِ نفس ہو، وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتا اب صرف متعدّد بیویوں کا مسئلہ رہ گیا۔ اس کو جدا عنوان سے بیان کرتے ہیں،

تعدّدِ زوجات

اس پر ہم دو طرح بحث کرتے ہیں، ایک بحیثیت مجموعی، دوم انفرادی حیثیت سے، مجموعی حیثیت سے یہ تحقیق کرنی ہے کہ جب دلائل سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضور علیہ السلام کے تعدّدِ زوجات میں قطعاً شائبہ نفسانیت شامل نہ تھا، کیونکہ آپ کی پوری زندگی نفسانی خواہش کے خلاف جہاد کا نمونہ تھی، اور اس وجہ سے بھی اگر تعدّدِ زوجات میں نفسانی خواہش کا دخل ہوتا تو آپ نوجوان حسیناؤں کا انتخاب کرتے۔ لیکن آپ کی جملہ زوجات بجز ایک کے سن رسیدہ اور بیوائیں تھیں، اس کے علاوہ نفسانی جوش کا زمانہ جوانی کا ہوتا ہے، لیکن جوانی سے لے کر ۵۲ سال کی عمر تک آپ نے ایک بوڑھی بیوہ عورت کے نکاح پر اکتفاء کیا، اس کے بعد کے بڑھاپے اور قریب الوصال وقت میں تعدد کی نوبت آئی تو

تعدّدِ زوجات کا اصل سبب تعلیمِ دین تھا

سببِ اوّل

اس تعدّدِ زوجات کا منشاء لازماً کوئی اور تھا اور وہ یہ تھا کہ حضور علیہ السلام کا قول و عمل اُمّت کے لیے ہدایت کا سامان اور نمونۂ عمل تھا، بلکہ تمام عالمِ انسانی کے لیے، کیونکہ آپ کی نبوّت، لیکون للعلمین نذیرا و رحمۃ للعلمین کی حیثیت سے بین الاقوامی تھا اور دروازہ نبوت کی بندش کی وجہ سے آپ کے ایک ایک قول و عمل اور اندرونِ خانہ زندگی کا کردار اور ازواج مطہرات سے آپ کا طرزِ معاش، ادائے حقوق اور اخلاقی زندگی کا پورا نقشہ اُمّت کے مرد اور عورتوں، شوہروں اور بیویوں دونوں کے لیے واجب العمل نمونہ تھا اور اسی نمونہ کے قالب

ہیں اپنی زندگی کو ڈھالنا لازمی تھا۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ یقیناً تمہارے لیے حضور علیہ السلام کے قول و عمل اور طرزِ زندگی میں انسانیتِ کاملہ کا بہتر نمونہ ہے، اس وجہ سے ایک ایسے ادارے کا قیام ضروری تھا، جو اس داخلی زندگی کی تعلیم کے لیے ازواج کے ذریعے وجود میں آیا، کیونکہ اسلام کے قانونِ حجاب کے تحت پیغمبرِ اسلام علیہ السلام سے امّت کی اجنبی عورت نہ بے حجابانہ مل سکتی تھی اور نہ پابندیٔ قانونِ پردہ کے تحت حضرت علیہ السّلام اجنبی عورتوں سے مل سکتے تھے اور نہ ہی اندرونِ خانہ زندگیٔ رسالت کے مشاہدہ کی صورت ہو سکتی تھی، اس لیے تکمیلِ تعلیمِ دین کے لیے منشاءِ الٰہی نے یہ انتظام کیا کہ ایسی عورتوں کا مختلف طبقات میں سے انتخاب ہو کہ وُہ طہارتِ نفس، پاکیزگیٔ قلب اور فہم دین میں امتیازی شان رکھتی ہوں، تاکہ وہ حضور علیہ السّلام سے علومِ دینیہ اور اسوۂ نبویہ بالخصوص مستورات سے متعلّقہ مسائل کو حاصل کر سکیں اور صحیح سمجھ سکیں اور امّت کو عموماً اور مستوراتِ امّت کو خصوصاً ان کی تعلیم دے سکیں، تاکہ حضور علیہ السّلام کی تعلیم کو مَردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر پہنچانے اور ابلاغ میں آسانی ہو اور گھر کے اندر کے احوال اور بالخصوص زوجات کے حقوق اور حسن معاشرہ کا صحیح نمونہ امت کو معلوم ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ خدیجہؓ کے بعد ازواجِ مطہرات کا انتخاب بھی حضور اکرم نے خود نہیں کیا، بلکہ وحی الٰہی سے ہوا، کہ اس کام کی صحیح اہلیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا تھا۔ حضرتِ خدیجہ اور زینب بنت خزیمہ نے حضور علیہ السلام کی زندگی میں وفات پائی اور نو بیویاں حضور علیہ السلام کی وفات کے وقت زندہ تھیں، یہ حدیث ملاحظہ ہو، عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماتزوجت شیئاً من نسائی ولا زوجت شیئاً من بناتی الا بوحی جاءنی بہ جبریل عن ربّی عزّوجل۔ اخرجہ عبدالمالک بن محمد بسندہ عیون الاثر ج ۲ ص۳۰۰ وزرقانی ج ۳ ص۲۱۹۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ زمانۂ نبوّت کی ازواجِ مطہرات کا انتخاب اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ آپ کی خواہشِ نفس کو اس میں دخل نہیں تھا، اس لیے بجز ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سب عمر رسیدہ اور بیوہ منتخب ہوئیں کہ کارِ تبلیغ و تعلیمِ دین کی پُوری اہلیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا تھا، جیسے نبی کا انتخاب خدا کرتا ہے، زوجیتِ نبی کا انتخاب بھی خدا نے کیا، کیونکہ مقصدِ نبوّت کی اہلیت اور مقصدِ زوجیتِ نبوت کا صحیح علم صرف خدا کو ہے، اس ادارۂ ازواج کا فائدہ یہ ہوا کہ نبوّتِ محمدی کے بہت سے علوم ازواجِ مطہرات کے ذریعے امّت کو پہنچے، ورنہ امّت ان علُوم سے محرُوم ہوتی۔

سببِ دوم پھر ان ازواجِ مطہرات کی ذواتِ قدسیہ میں شدتِ تعلق کی وجہ سے جو اخلاق زکیہ و فضائل و محا

حضور علیہ السلام سے منتقل ہوئے۔ وہ پوری امت اور امت کی مستورات کے لیے نمونۂ عمل ہیں۔

کتب سیر و رجال میں ان ازواج مطہرات کی عبادت، روزے، تلاوتِ قرآن، ذکراللہ، سخاوت، ترکِ محبتِ مال، قناعت، فکرِ آخرت، اتباعِ شریعت کے جو احوال درج ہیں، ان کو دیکھ کر ایمان قوی ہو جاتا ہے، اس لیے قرآن پاک نے فرمایا۔ وازواجہ امہاتہم کہ حضور علیہ السلام کی بیویاں امّت کی مائیں ہیں، جیسے حضور علیہ السلام امت کے باپ ہیں، یعنی جیسے ایمان کی تازگی و حیات میں احوالِ نبی کو دخل ہے۔ احوالِ زوجاتِ نبی کو بھی دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لستن کاحد من النساء۔ تم (زوجاتِ پیغمبر!) دیگر عورتوں کی طرح نہیں ہو، بلکہ تمہارا مقام بہت بلند ہے۔

سببِ سوم

دینِ حق و عدلِ الٰہی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کینہ پرور عربوں کے انتقامی جذبات کا فطری جوش تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ تعلیمِ امّت کے لیے دائرہ زوجیت میں جن مستورات کا انتخاب ہو، ان سے مقصدِ تعلیمِ امّت کے علاوہ ان زخموں کی بھی مرہم پٹّی کی جائے جو مقابلۂ دینِ حق میں ان کے خاندانوں کو پہنچ چکے ہیں، اور ان کا سبب اگرچہ ان کے اپنے کیے ہوئے جرائم و اعمال ہی تھے، مگر ان بااثر و قوی خاندانوں کی وجہ سے جو اشاعتِ حق کی راہ میں ایک تاریخی عداوت اور انتقام کیشی کی فضا پیدا ہو چلی تھی، جس کا دُور کرنا ضروری تھا۔ (باقی آئندہ)

ایک ضروری گذارش

قارئین کرام سے مکرر گذارش کی جاتی ہے کہ انوار مدینہ کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں ادارہ سے تعاون فرمایا جائے یہ ایک دینی رسالہ ہے اس لیے اسے پھیلانا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کے علمی مضامین سے استفادہ پر آمادہ کرنا باعثِ ثواب ہے۔ لہٰذا درخواست ہے کہ اس سلسلے میں آپ جسقدر بھی تعاون فرما سکتے ہیں ضرور فرمایئے۔

ہم ایسے تمام معزز قارئین سے جن کی خدمت میں اب تک رسالہ اعزازی طور پر بھیجا جاتا رہا ملتمس ہیں کہ اگر وہ آئندہ سالانہ چندہ ارسال فرما کر اس کی خریداری قبول فرمالیں تو بہت بہتر ہوگا۔ اس طرح سے جامعہ مدنیہ کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور وہ بھی اس کارِ خیر کی معاونت پر اجر کے مستحق ہونگے اور ممکن ہے کہ ان کے تعاون سے ہم رسالہ کو اس سے زیادہ بہتر شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

——— (جناب محترم) ماسٹر عطاء اللہ خاں۔ مینجر ماہنامہ انوارِ مدینہ۔ جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور

فتنوں کی سرکوبی

قسط: ۱۴

اُولٰئِکَ ھُمُ الرَّاشِدُوْنَ

"خلافت وملوکیت" کے جواب میں!

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سیّد محمّد میاں ادام اللہ معالیھم

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو شمارہ نمبر ۹)

سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ اور شام و فلسطین و اُردن

شہادت فاروق اعظمؓ کے بعد جنگ کی پالیسی میں تبدیلی

مودودی صاحب جیسا شخص جو ایک جماعت کا امیر بھی ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا عَلم قیادت بلند ہو، ضروری ہے کہ وہ صاحب الرائے، صائب الفکر ہو اس کا ظرف بھی وسیع ہونا چاہیئے، اور کسی موضوع پر کچھ لکھے تو اس کا مطالعہ بھی وسیع ہونا چاہیئے۔ مگر افسوس ہمارا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔ تحریر فرماتے ہیں:

حضرت معاویہ اس صوبہ کی حکومت پر اتنی طویل مدت تک رکھے گئے انہوں نے اپنی جڑیں پوری طرح جمالیں۔ (ص ۱۱۵)

آپ نے یہ اعتراض مختلف پیرایوں میں بار بار دہرایا ہے۔ مثلاً ص ۱۰۸، ۲۰۵ وغیرہ، لیکن یہ اعتراض وہی کر سکتا ہے جو فہم و فراست، انصاف و دیانت، فکر و دانش سے کام نہ لے یا وہ واقعات سے ناواقف اور اس کا مطالعہ تاریخ کے چند صفحات تک محدود ہو یا بغض و عناد نے اسکی فہم و فراست اور انصاف پسندی کو بالا بر طاق رکھ دیا ہو۔

واقعات کو نظرِ انصاف سے ملاحظہ فرمایئے آپ کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ صورت ہرگز نہیں ہے کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کو اس صوبہ کی حکومت سے الگ کر سکتے تھے اور الگ نہیں کیا۔ بلکہ صورتِ حال یہ ہے کہ اگر حضرت عثمان حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کو الگ کرتے تو ملت کے حق میں بہت بڑی خیانت کرتے اور مملکتِ اسلامیہ کے مفادات کو خود اپنے ہاتھ سے فنا کے گھاٹ اتار دیتے۔ اس معمہ کا حل ملاحظہ فرمایئے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ جیسے ہی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملک سے باہر پہنچی تو شکست خوردہ قوموں نے عَلم بغاوت بلند کر دیا۔ مخالف طاقتیں مملکت اسلامیہ پر ٹوٹ پڑیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاقہ پر رُومی فوجوں نے ایسی یورش کر دی کہ حضرت معاویہ جو دوسروں کی مدد کیا کرتے تھے اس وقت مرکز سے امداد لینے پر مجبور ہُوئے چنانچہ کم و بیش دس ہزار مجاہدین کی فوج ان کی امداد کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے بھیجی گئی۔

(تاریخ طبری ص ۴۶، ج ۵) تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

پالیسی میں تبدیلی

شام اور فلسطین کا پورا علاقہ فتح ہو چکا اور تطہیر جزیرۃ العرب کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان گرامی کی تعمیل ہو گئی تو سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قائدینِ افواج کو اقدام کی اجازت نہیں دی۔

شام کے امیر سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا اصرار تھا کہ ان کو قبرص پر حملہ کی اجازت دی جائے حضرت معاویہ نے یہ بھی لکھا کہ یہ علاقہ شام کی سرحد سے اتنا قریب ہے کہ رات کو اس طرف کتّے بھونکتے ہیں تو انکی آواز اس طرف سنائی دیتی ہے۔ مگر سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اقدام کی اجازت نہیں دی۔ (طبری ص ۵۔ ج ۵)

ممکن ہے سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہو کہ تسخیر مملکت کے بجائے دلوں کو مسخر کرنا زیادہ مفید اور دعوتِ اسلام کے مقصد کے عین مطابق ہے۔

سیّدنا فاروق اعظم رض کی اس پالیسی کا اثر یہ ہوا کہ شہنشاہ روم نے فوجی طاقت بڑھانے کے بجائے سیّدنا فاروق اعظم سے دوستانہ تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ گویا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک باخدا رہنما ماننے لگا چنانچہ حضرت عمر فاروق کو لکھا۔

مجھے ایسی بات تحریر فرمایئے جو فہم و دانش کا مخزن ہو، گویا پُورا علم اس میں سمویا ہوا ہو۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا۔

احب للناس ما تحب لنفسك واكره لهم ما تكره لنفسك۔

سب انسانوں کے لیے وہ چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو اور جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو۔

ایسے ہی سوالات اور بھی کیے۔ جن کے دانشمندانہ جوابات حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف سے دیئے گئے۔

استفادہ اور افادہ سے بڑھ کر تحفوں اور ہدیوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی ایک اہلیہ۔ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اُمّ کلثوم تھیں۔ انہیں کچھ خیال آیا۔ انہوں نے شہنشاہِ روم کی بیوی کو کچھ چیزیں بطورِ ہدیہ بھیجیں۔

ملکۂ روم اس غیر متوقع نوازش سے اتنی خوش ہوئی کہ اس نے گویا ایک جشن منایا۔ عورتوں کو دعوت دیکر بلایا اور کہا۔

شاہ عرب کی بیگم نے جو اُن کے نبی کی نواسی بھی ہے۔ یہ ہدیہ بھیجا ہے۔ ان سے میری خط و کتابت بھی رہتی ہے۔ مجھے اس کا کیا جواب دینا چاہیئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں بھی کچھ تحفے بھیج رہی ہوں۔

ملکۂ روم نے جو ہدیئے بھیجے اُن میں ایک بہت قیمتی ہار بھی تھا۔ یہ قیمتی ہدیئے ملکۂ اسلام کے پاس پہنچے تو شہنشاہِ اسلام سیّدنا فاروق اعظم کی شان دوسری تھی۔ آپ نے فوراً ایک عام اجتماع کیا۔ پہلے دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

جو کام مشورے کے بغیر کیا جائے اُس میں "خیر" نہیں ہوتا۔ اُمّ کلثوم نے کچھ تحفے ہرقل کی بیوی کو بھیجے تھے اس نے یہ قیمتی چیزیں ہدیہ میں بھیجی ہیں۔ آپ حضرات مشورہ دیں کہ ان کا کیا کرنا چاہیئے۔

حاضرین نے جواب دیا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہدیہ کے جواب میں ہدیہ بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا جس نے ہدیہ بھیجا تھا اس کو یہ چیزیں ملنی چاہئیں۔

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ۔ لیکن قاصد تو سرکاری تھا۔ جس سواری پر سفر کیا وہ سرکاری تھی اور اس کا اثر تمام مسلمانوں پر پڑا ہے کہ آپ سب اس کو بڑی بات سمجھ رہے ہیں۔ پھر یہ انفرادی اور شخصی بات کیسے رہی۔ اس میں تو سب مسلمانوں کا حصّہ ہے، چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان ہدایا کو فروخت کرا کر قیمت بیت المال میں داخل کرادی، البتہ حضرت اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا کا جو خرچ ہوا تھا وہ ان کو دلوا دیا۔ (طبری ص ۵۲ - ج ۵)

شہنشاہِ روم اور اسکی بیوی کا یہ تعلق سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کے اہلِ خانہ سے تھا جس میں کہیں جنگ و جدال اور حرب و قتال کی بو نہیں آتی۔

ممکن تھا کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا مشفقانہ انداز بار آور ہوتا اور اسی راہ سے دعوتِ اسلام کا عظیم ترین مقصد

کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتا۔

لیکن شہادت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خبر خدا جانے کیسی بجلی تھی جس نے سفید فام رومیوں کے دلوں کی سیاہی کو ایک دم نمایاں کر دیا۔ جیسے ہی یہ خبر پھیلی یہی رومی دوست دشمن بن گئے اور اُن کے لشکروں نے شام کو اسطرح گھیر لیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مرکز سے امداد طلب کرتے ہوئے لکھنا پڑا۔

ان الروم قد اجلبت علی المسلمین بجموع عظیمۃ[1] (طبری ص ۴۶-ج ۵)

اب معاملہ صرف دفاع کا نہیں رہا، بلکہ سوال پالیسی کا ہو گیا۔ یعنی یہ سوال پیدا ہو گیا کہ دشمن کی موجودہ پوزیشن کو ختم کرنے کے بعد ہماری جدوجہد صرف سرحدوں کی حفاظت کے انتظام تک محدود رہنی چاہیئے یا ایسا اقدام کرنا چاہیئے کہ دشمنوں کی ہمتیں پست ہو جائیں اور وہ آئندہ اس طرح یورش نہ کر سکیں۔ نیز یہ کہ ہماری مملکت کی آخری حدود یہی رہنی چاہئیں، جو اَب ہیں یا ان حدود کی حفاظت کے لیے ہمیں کچھ آگے بڑھ کر دفاعی لائن قائم کرنی چاہیئے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اصرار تھا کہ قبرص پر حملہ کی اجازت دی جائے، مگر حضرت فاروق اعظم نے اجازت نہیں دی۔ اب پھر موقع آیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ثالث سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے قبرص پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی۔ قبرص پر حملہ صرف ایک چھوٹے سے جزیرے پر حملہ نہیں تھا جو اتنا قریب ہے کہ وہاں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ بلکہ قبرص پر حملہ کرنے کے معنی یہ تھے کہ۔

۱۔ رومیوں کی رگِ حمیت پر ضرب لگائی جا رہی ہے۔

۲۔ اب تک رومیوں کو اپنے ملک یعنی جزیرۃ العرب سے نکالا تھا اب انکی ایسی نوآبادی پر حملہ کیا جا رہا ہے جس سے کوئی جغرافیائی، نسلی یا مذہبی تعلق عربوں کا نہیں ہے۔

۳۔ عرب بّری (خشکی کی) جنگ کے عادی تھے اس میں انہوں نے غیر معمولی فتوحات حاصل کیں اب ان کو بحری جنگ کے لیے ابھارا جا رہا ہے جس کا ان کو پہلے سے تجربہ نہیں ہے۔

۴۔ عربوں کی بحری طاقت صفر ہے۔ ایسی حالت میں ان کو ایسی شاہنشاہیت کے مقابلہ پر لایا جا رہا ہے۔ جس کی بحری طاقت بے پناہ ہے۔

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ احساس ۳ و ۴ کا تھا وہ اس کو درست نہیں سمجھتے تھے کہ

---

[1] روم نے مسلمانوں پر بڑے بڑے لشکروں سے چڑھائی کر دی ہے۔

مہارت اور طاقت کے بغیر بحری جنگ کا سلسلہ شروع کیا جائے ایسی حالت میں کہ ناکامی یقینی ہو اقدام جائز نہیں ، چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہی تحریر فرمایا کہ میرے نزدیک ایک مسلمان کی جان روم کی پوری مملکت سے زیادہ محبوب ہے ۔

"تا اللہ لمسلم احب الیّ مما حوت الروم (طبری ص ۵۲، ج ۵)

اس کے علاوہ ایران کے معرکوں سے بھی ابھی پوری طرح فراغت نہیں ہوئی تھی یزدجرد شاہ ایران زندہ تھا اور اسکی ریشہ دوانی جاری تھی اور فاروق اعظم کی فراست وبصیرت ان جراثیم کو بھی دیکھ رہی تھی جو ایران میں موجود تھے جو آگے چل کر خطرہ عظیم بننے والے تھے ، ایسی صورت میں بہت مشکل تھا کہ عربوں کو بحری محاذ پر کھڑا کر دیا جائے ۔

اب اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو قبرص پر حملہ کی اجازت دی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ایسی جنگ کا ذمہ دار بنایا جارہا ہے جس کا عرض وطول بہت وسیع ہو سکتا ہے جو ساحلِ افریقہ سے آگے بڑھ کر یورپ تک پہنچ سکتا ہے ۔ جس کے لیے بحری طاقت بھی فراہم کرنی ہوگی ۔ جہازوں کی تیاری کے لیے بہت بڑا سرمایہ ، سرمایہ کیساتھ بیشمار کاریگر انجینئر اور بحری جنگ کے ایسے ماہر بھی فراہم کرنے ہونگے جو عربوں کو بحری جنگ کی مشق کرائیں ۔

مودودی صاحب کے دماغ پر تو صرف ایک بات مسلّط ہے کہ حضرت معاویہ ، حضرت عثمان کے ہم جد تھے ۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ ان کو دمشق کی گورنری سے یک قلم برخاست کر دیتے ، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ بات عقل سلیم سے بہت بعید ہے ۔

یہ درست ہے کہ ایران کے محاذ پر بہت ہی خطرناک صورت درپیش تھی ۔ جب سیّدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سیّدنا حضرت سعد بن ابی الوقاص رضی اللہ عنہ کو امارت کوفہ سے معزول کیا تھا اور بہت ہی نازک صورت شام کے محاذ پر درپیش تھی جب سیّدنا خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو اُن کے منصب سے معزول کیا تھا ۔ اس محاذ کی سب سے بڑی جنگ ، جنگِ یرموک کا میدان گرم تھا یا اسکی ہماہمی تھی ۔ جب سیّدنا خالد بن الولید کے پاس منصب سے معزولی کا فرمانِ فاروقی پہنچا تھا ، مگر سیّدنا سعد بن ابی الوقاص رضی اللہ عنہ کے متعلق اہلِ کوفہ نے شکایتی میمورنڈم پیش کیا تھا جو اگرچہ سراسر بے بنیاد تھا ، مگر بہرحال پیش کیا گیا تھا ——— اور سیدنا خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے متعلق اگرچہ عوام کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی بلکہ عوام میں ان کی غیر معمولی شہرت ومقبولیت

تھی، مگر خود فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اُن سے بہت سخت شکایت تھی، لیکن سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ کمال بہت ہی زیادہ قابلِ قدر اور حیرت انگیز ہے کہ ان کے متعلق نہ اس وقت تک کوئی شکایت بارگاہ خلافت تک پہنچائی جا سکی نہ ان کے آئندہ دورِ حکومت میں کوئی شکایت عوام کی طرف سے پیش ہوئی نہ جلیل القدر خلیفہ دوم اور خلیفہ سوم کو ان سے کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ ایسی صورت میں ان کو معزول کیا جاتا تو وہ دماغ کی بات نہ ہوتی بلکہ بے دماغی کی کھلی دلیل اور دین وملّت کے حق میں بہت بڑی خیانت ہوتی۔

پالیسی بدلنے کی ضرورت

اس بات کی معقولیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رومیوں کی غداری نے جب مملکتِ اسلامیہ کے لیے موت و حیات کا سوال پیدا کر دیا تھا تو مملکت اسلامیہ کے ذمہ داروں کو پائیدار تحفظ کی صورتیں سوچنی تھیں اور ان کو عمل میں لانا تھا۔

بحری جنگ کا آغاز

سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا مدبر اس اقدام کی اجازت طلب کر رہا تھا تو لامحالہ اقدام کے لوازم سے واقف ہوگا۔ یعنی سامانِ جنگ اور سرمایہ وغیرہ ضروریات اقدام کا بھی اس کو اندازہ ہوگا اور پیش آنے والے خطرات کا بھی اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اس کا کچھ انتظام بھی کر لیا ہوگا یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی اجازت ملی۔ بڑے ولولہ اور جذبے سے انہوں نے اقدام شروع کر دیا پھر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جس طرح ان کی حمایت فرمائی اس نے ان کے ولولہ میں اور اضافہ کر دیا۔

سیّدنا ابو ذر غفاری، حضرت مقداد، حضرت ابو درداء، حضرت شداد بن اوس جیسے اکابر صحابہ اس فوج میں شریک تھے اُن کے ساتھ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور انکی اہلیہ محترمہ "ام حرام" بھی تھیں۔ (طبری ص ۵۱، ج ۵) ان کیساتھ وہ پروانہ بشارت بھی تھا جس کو سید الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روز عطا فرمایا تھا۔ جس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حجرہ کو راحت کدہ بنایا تھا۔

محترمہ ام حرام بنت ملحان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوتی تھیں آپ ان کے یہاں تشریف لیجایا کرتے تھے۔ ایک روز کھانا ان کے یہاں تناول فرمایا پھر کچھ آرام فرمایا۔ بیدار ہوئے تو لب مبارک پر تبسم تھا۔ حضرت ام حرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ آپ کو ہمیشہ خنداں و شاداں رکھے اس وقت تبسم کیسا۔ فرمایا میرے سامنے میری امّت کے وہ غازی فی سبیل اللہ پیش کیے گئے جو اس سمندر کے سینے پر سوار ہو کر سفر کریں گے۔ اس شان سے جیسے تخت نشین

بادشاہ ہوں۔

محترمہ ام حرام نے عرض کیا۔ یارسول اللہ دعا فرمایئے۔ اللہ تعالےٰ ان میں مجھے بھی شامل فرمادے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی پھر آپ مشغول استراحت ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھُلی تو لب مُبارک اسی طرح تبسّم فرما تھے حضرت ام حرام نے سبب دریافت کیا تو پھر وہی جواب دیا گیا کہ میرے سامنے میری امت کے ایسے غازی پیش کیے گئے جو سینۂ سمندر پر سوار ہوکر شاہانہ انداز سے سفر کریں گے۔

حضرت ام حرام نے پھر عرض کیا یارسول اللہ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالےٰ مجھے بھی ان میں شامل فرمادے، فرمایا تم پہلے غازیوں میں ہوگی۔ (بخاری شریف ص ۳۹۱، ۴۰۳ ومسلم وترمذی وغیرہ)

ارشادِ گرامی آئینہ مشیتِ خداوندی تھا۔ حرف بحرف صادق ہوا، یہ محترمہ جب اس غزوہ سے واپس ہو رہی تھیں اپنی سواری سے سر کے بل گریں اور شہید ہوگئیں۔ اس غزوہ کے لیے سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی تیاری کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ سفر شاہانہ شان سے ہوا تھا اور جب یہ غازی خواب یا مشاہدہ روحانی میں اسی شان کے ساتھ فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیے گئے تو اس شان وشوکت نے منظوری بھی حاصل کرلی۔ سیّدنا حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے شام میں جب حضرت معاویہ کی شاہانہ شان دیکھی تھی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسکی جو مصلحت بیان کی۔ فاروق اعظم رضی اللہ نے اس کی نہ تصدیق کی تھی نہ تردید، مگر رویاء صادق اور پیغمبرانہ خواب میں جب سینہ سمندر پر سوار غازیوں کی شاہانہ شان نے شرف پسندیدگی حاصل کیا تو مستحق مبارکباد ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہ اُن کی مصلحت نے بھی شرف منظوری حاصل کرلیا جس طرح مستحق مبارکباد ہیں اس بحری سفر کے تمام مجاہد کہ لِسان رسالت نے ان کو غازی فی سبیل اللہ فرمایا۔ زہے قسمت۔

اس اقدام کے نتیجہ میں جو غیر معمولی فتوحات ہوئیں جس نے مملکت اسلامیہ کی حدود کو یورپ اور افریقہ تک پہنچادیا۔ ان کا بیان کرنا موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ کی شہادت نے ایسا انقلاب برپا کیا کہ دوست ممالک دشمن بن گئے۔ جس حوصلہ اور بلند آہنگی سے حملہ آور طاقتوں کا دفاع کیا گیا وہ بھی قابلِ قدر ہے لیکن اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر یہ ہے کہ دفاع کے بعد اقدام کی ہمت کی گئی۔ حالات نامساعد تھے۔ اس طرف شہنشاہِ روم کی فوجیں تھیں تو دوسری طرف ایران کا وسیع علاقہ تھا جہاں جگہ جگہ بغاوت ہو رہی تھی اور اس نوعمر مملکت کو صفحۂ ہستی

سے مٹانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

سیّدنا معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کا حوصلہ بھی قابلِ قدر ہے کہ آپ شہنشاہِ روم کی طاقت سے ٹکرانے کے لیے آگے بڑھے، مگر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور قابلِ صد ستائش خلیفۂ سوم کا حوصلہ تھا جو اپنی عمر کے ستّر سال پورے کر چکا تھا اور یقین کیا جاتا تھا کہ دولت کے سایہ میں یہ ناز پروردہ تن سیمیں۔ فولادی انسان نہیں بن سکتا، لیکن جب اس نے بیک وقت ایران، مصر اور شام کے تینوں محاذوں پر اقدام کی پالیسی اختیار کی اور اس وقت تک اس کو نباہتا رہا جب تک ہر محاذ پر مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوگئی تو ہر ایک صاحب انصاف کو یقین کرنا پڑا کہ دربارِ رسالت کا یہ فیض یافتہ فولادی انسان نہیں، بلکہ عزم و استقلال کا پہاڑ ہے۔ اس کے لیے شہید کا خطاب جو لسانِ رسالت سے صادر ہوا بالکل صحیح ہے اور وہ یقیناً اُن میں ہے جن کے صبر و استقامت اور عزم و استقلال کے پرتو سے اُحد جیسا لرزتا ہوا پہاڑ بھی سکون اختیار کر لیتا ہے۔

علاقہ میں توسیع

آپ شام کا نقشہ سامنے رکھئے۔ دمشق کا کوئی بھی کنارہ سمندر سے ملا ہوا نہیں ہے۔ سامنے کوہ لبنان ہے۔ پھر ساحلِ سمندر صوبہ لبنان ہے۔ اس کے ایک جانب فلسطین۔ دوسری جانب شمال کی طرف حمص اور جانب جنوب میں اردن۔ دمشق کا نہ کوئی بندرگاہ ہے نہ کوئی بندرگاہ ہو سکتا ہے۔ لبنان یا فلسطین جب تک راستہ نہ دیں اہل دمشق سمندر تک نہیں پہنچ سکتے۔

سیدنا معاویہ حضرت عمر رضی اللّٰہ عنہما کے زمانہ میں صرف دمشق کے والی اور امیر تھے اور اگرچہ طبری کی تحقیق یہ ہے کہ سیّدنا عمر بن الخطاب ہی نے علاقہ اُردن اُنکی ولایت میں داخل کر دیا تھا، مگر فرض کر لیجیے یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللّٰہ عنہ نے علاقہ اُردن ان کے سپرد کیا، لیکن سوال یہ ہے کہ جب اس محاذ کا ذمہ دار حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کو بنایا گیا تو کیا خلیفہ کا فرض نہیں تھا کہ انکی قوت میں اضافہ کرے۔

دورِ خلافتِ راشدہ کے مالی اور فوجی نظام کی تفصیل تو بہت طویل ہے، لیکن اس مختصر بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علاقوں کے والی (گورنر یا کمشنر) اگرچہ صلح و جنگ کی پالیسی طے کرنے میں مرکز کے محتاج اور اسی کے تابع ہوتے تھے، مگر اپنے علاقہ کے تحفظ اور دفاع کی ذمہ داری زیادہ تر ان گورنروں پر ہی ہوتی تھی کسی شدید ضرورت کے وقت ہی مرکز سے امداد دی جاتی تھی ورنہ اپنے میزانیہ (بجٹ) کے ذمہ دار وہ خود ہوتے تھے۔ شریعت کی مقرر کردہ حدود کی پابندی لازمی

ہوتی تھی۔ حدود شریعت سے باہر نہ کچھ وصول کیا جاسکتا تھا نہ خرچ، لیکن خرچ کے لیے جائز آمدنی کا اضافہ حکومت صوبہ کے ذمہ ہوتا تھا۔ اب غور فرمائیے اس محاذ پر جیسے جیسے جنگ کے دامن پھیلتے رہے۔ کیا اس کے مصارف کا تحمل وہ کر سکتا جس کی آمدنی کے ذرائع حدود دمشق تک محدود ہوں اقدام کی اجازت دینا اور ذرائع آمدنی میں توسیع نہ کرنا، سراسر ظلم تھا نہ صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں بلکہ مفادِ ملّت کے حق میں عظمت اسلام کے حق میں۔

یہ معاملہ اردن اور حمص کا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا اضافہ اسی لیے کیا گیا کہ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جنگ عظیم کے بڑھتے ہوئے مصارف پورے کر سکیں۔ باقی رہ گئے لبنان اور فلسطین وہ اگر الگ رکھے جاتے اور ولایتِ معاویہ رضی اللہ عنہ میں ان کو داخل نہ کیا جاتا تو اس کی مثال ایسی ہوتی کہ بحری جنگ کا ذمہ دار گورنر سندھ کو بنا دیا جائے اور کراچی اس کے حوالے نہ کیا جائے اس کا حکمران کوئی اور ہو۔

پھر جب اس بڑھتی ہوئی جنگ کا تقاضا یہ ہو کہ مملکتِ اسلامیہ[1] کے ساحلی علاقوں کو محفوظ کیا جائے اور اس تحفظ کے لیے بحری بیڑہ بھی رکھنا ضروری ہو تو جب تک لبنان اور فلسطین اس کے زیرِ نگیں نہ ہوں تو کیا حاکم دمشق کے لیے ممکن تھا کہ بحری بیڑہ تیار کر لیتا اور مملکت اسلامیہ کے ساحلی علاقوں کو محفوظ کر دیتا۔

یہ کھلی ہوئی باتیں اور واضح حقیقتیں ہیں۔ ان میں نہ سخن سازی ہے نہ تصنع اور تکلف، لیکن تعجب ہے مودودی صاحب ان کھلی ہوئی باتوں کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہیں اور کیوں الزام لگا رہے ہیں کہ حضرت عثمان نے انکی گورنری میں دمشق۔ حمص۔ فلسطین۔ اردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۰۸)

بیشک جمع کر دیا، مگر رشتہ دار کی رعایت کے لیے یا اُس فرض کو انجام دینے کے لیے جو آپ پر بحیثیت خلیفہ واجب اور لازم تھا؟

صورتِ توسیع

ان علاقوں کے امراء کو اگر معزول کر دیا جاتا یا بدل دیا جاتا تو مصالح جنگ کے لحاظ سے وہ بھی غلط نہ تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے معزول کسی کو نہیں کیا بلکہ حمص و قنسرین کے والی حضرت عمیر بن سعد اپنی طویل علالت کے باعث استعفے پر مجبور ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ کوئی والی مقرر نہیں کیا۔ بلکہ اس ضلع کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے صوبہ میں داخل کر دیا۔ (طبری ص ۶۹ - ج ۵) والیٔ فلسطین حضرت عبدالرحمٰن بن علقمہ کنانی تھے۔ [1]

---

[1] حاشیہ صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ ہو۔

لطیفہ مودودی صاحب اس انداز سے یہ الزام لگا رہے ہیں کہ جیسے فلسطین، لبنان، اردن اور حمص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاقہ میں شامل کر کے مملکتِ اسلامیہ کا بڑا حصہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ حالانکہ ان سب کی حیثیت کمشنری سے زیادہ نہیں۔ مبالغہ سے کام لیا جائے تب کہا جا سکتا ہے کہ حمص کا علاقہ کمشنری کے برابر تھا ورنہ علاقہ حمص و قنسرین ایک کلکٹری کی برابر تھا۔ فلسطین و لبنان اور اردن کے حدود ایک ایک کمشنری سے زیادہ نہیں۔ ان سب کو ملانے کے بعد بھی پورا علاقۂ شام مملکت اسلامیہ کا آٹھواں یا دسواں حصہ ہوتا تھا۔ عراق، نجد، حجاز، مصر، ایران وغیرہ کے علاقے جو پورے شام کی برابر یا اس سے بھی زیادہ تھے۔ مملکت اسلامیہ کے صوبے تھے۔

یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے اور حضرات صحابہ کے باہمی نزاعات کے بارے میں نہ لب کشائی درست ہے نہ خامہ فرسائی۔ اس لیے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔

تبادلہ کیوں نہیں کیا مودودی صاحب بغض صحابہ کے مرض میں مبتلا اور شیعی پروپیگنڈے سے متاثر ہیں یہی وجہ ہے کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے میں آپ "دیوانہ را ہوئے بس است" کی مثال بن جاتے ہیں۔ بظاہر یہ اعتراض شیعوں کا ہے۔ جس کو آپ نے اپنا لیا ہے کہ :-

> حضرت معاویہ کو مسلسل ۱۶۔ ۱۷ سال تک ایک ہی صوبے کا گورنر رہنے دینا شرعاً ناجائز نہ تھا، مگر سیاسی تدبّر کے لحاظ سے نامناسب ضرور تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خواہ مخواہ کسی قصور کے بغیر ان کو معزول کر دیا جاتا۔ صرف یہ بات کافی تھی کہ ہر چند سال کے بعد ان کا تبادلہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے کی گورنری پر کیا جاتا رہتا۔ اس صورت میں وہ کسی ایک صوبے میں بھی اتنے طاقتور نہیں ہو سکتے تھے کہ کسی وقت مرکز کے مقابلہ پر تلوار لے کر کھڑا ہونا ان کے لیے ممکن ہوتا (خلافت و ملوکیت ص ۳۲۵/۳۲۶)

اس بات کو آپ نظر انداز کر دیجیے کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت صرف بارہ سال ہے اور

(حاشیہ ص ۲۵) ان کی وفات ہو گئی تو اس علاقہ کو بھی حضرت معاویہؓ کے صوبہ میں داخل کر دیا۔ اسی طرح اردن کی شمولیت بھی حاکم اردن کی وفات کے بعد ہوئی۔ (طبری ص ۶۹۔ ج ۵)

آپ پر الزام وہ لگایا جا رہا ہے جس کی عمر ۱۶۔ ۱۷ سال ہے۔ مودودی صاحب کی اس انصاف پسندی سے صرف نظر کرتے ہوئے ان حالات پر نظر ڈالیے جو سیّدنا فاروقِ اعظمؓ کی شہادت کے بعد اس محاذ پر پیش آئے جن کو تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان واقعی حالات کو سامنے رکھا جائے تو گویا مودودی صاحب کا منشا یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سیاسی تدبّر یہ ہوتا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد۔

(الف) جب رومی فوجیں یورش کرتے ہوئے شام میں گھس آئی تھیں اور حضرت معاویہ اپنی پوری طاقت نیز مرکز سے مدد حاصل کر کے ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔

(ب) یا جب دشمن فوجوں کو دھکیلنے کے بعد قبرص پر حملہ کر رہے تھے کہ مملکتِ اسلامیہ اس کے خطرہ سے آئندہ محفوظ رہے۔

(ج) یا جب دفاعی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے بحری بیڑا ترتیب دے رہے تھے۔

(د) یا جب فتح قبرص کے بعد اس علاقہ کی مخالف طاقتوں کو زیر کرتے ہوئے ہیبتِ اسلام کا سکہ انکے دِلوں پر بٹھا رہے تھے۔

(ہ) یا جب اس محاذ کے سب سے بڑے معرکہ میں جو "غزوۃ الصواری" کے نام سے مشہور ہے جس میں شہنشاہِ روم قسطنطین اپنی پوری فوجی طاقت مسلمانوں کے استیصال کے لیے میدان میں لے آیا تھا۔ (طبری ص ۶۸، ۶۹، ج ۵)

سیّدنا حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما غیرت اسلام اور حمیت و شجاعت کے وہ جوہر دکھا رہے تھے جنہوں نے مخالف پرچموں کو سرنگوں اور پرچم اسلام کو ہمیشہ کے لیے سربلند کیا۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا سیاسی تدبّر یہ ہوتا کہ خاص ان حالات میں حضرت معاویہ کو معزول نہ کرتے تو کم از کم ان کا تبادلہ کر دیتے۔ آپ خود فیصلہ فرمائیے کہ مودودی صاحب کا یہ ارشاد کہاں تک صحیح ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ان غزوات سے فراغت کے بعد موقع تھا کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تبادلہ کر دیتے لیکن اسوقت اس زمانہ کا آغاز ہو چکا تھا جب حضرت عثمانؓ کوفہ اور بصرہ کے گورنروں کا تبادلہ کر کے اس کے تلخ نتائج کا تجربہ کر رہے تھے۔ ان تبادلوں کا نتیجہ یہ تھا کہ جب بلوائیوں کے خلفشار سے کچھ پہلے سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے

صوبجات کے امراء کا اجتماع کیا تو نہ گورنر بصرہ کوئی اطمینان بخش بات کہہ سکے نہ گورنر کوفہ۔ البتہ سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ قد ولیتنی ولیت قومًا لا یاتیک عنہم الا الخیر۔ (طبری ص ۹۹-ج ۵)

آپ نے مجھے حکومت کا ایک منصب عطا فرمایا ہے۔ آپ نے ایک ایسی قوم کا حاکم بنایا ہے کہ اس سے آپ کو بھلائی ہی پہنچے گی۔

اس موقع پر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ آپ کے ساتھ شام تشریف لے چلیں تو ان شرارتوں سے محفوظ رہیں گے۔ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اپنے آقا رسول اللہ کے شہر اور اپنے دارالہجرت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ حضرت معاویہ نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں یہاں ایک فوج مقرر کر دوں، فرمایا اس سے اہلِ مدینہ کو پریشانی ہوگی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ نے عرض کیا کہ آپ کے متعلق بہت خطرہ ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب تھا۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

بہر حال یہ درست ہے کہ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ مضبوط امیر اور گورنر تھے اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی جڑیں جمی ہوئی تھیں، مگر یہ مضبوطی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خویش نوازی کی رہین منت نہیں تھی، بلکہ جڑیں تو اس وقت جمی تھیں جب فتوحاتِ شام کے سلسلہ میں اُن کے پورے گھرانے (باپ، بھائی، والدہ، بہن، بہنوئی) نے غیر معمولی قربانیاں پیش کی تھیں، کیونکہ حضرت ابوسفیان کا خیال تھا کہ ہم نے اسلام لانے میں دیر کی ہے۔ اس لیے ہم بہت پچھڑ گئے ہیں۔ اب ہم سابقین اولین کے ہم دوش جب ہی ہو سکتے ہیں کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے غیر معمولی قربانیاں پیش کریں۔ (البدایۃ والنہایۃ۔ ص ۱۱۸-ج ۸)

پھر یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی عمل نہیں بلکہ محض اللہ کا لطف و کرم تھا کہ اُس نے اس خاندان کو غیر معمولی قربانیاں پیش کرنے اور عظیم الشان خدمات انجام دینے کا موقع بھی عنایت فرمایا۔ مثلاً حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد رومیوں نے یورش کی اور اس محاذ کے حالات نے اقدام کا تقاضا کیا تو جس بلند آہنگی اور اولوالعزمی سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس تقاضے کو پورا کیا۔ اس میں حضرت عثمان کے کسی فعل کو دخل نہیں تھا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا کہ اس نے حضرت معاویہ کو یہ توفیق بخشی۔ یہ توفیق ایک کرامت تھی جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ظاہر ہوئی۔ یعنی صرف پانچ چھ سال کے عرصہ میں فتوحاتِ اسلام کا دائرہ آپ کی زیرِ قیادت کہیں سے کہیں

پہنچ گیا۔ ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار ہوگیا۔ یورپ کی تمام جبروتی طاقتیں جو اسلام کے خلاف تھیں۔ وہ مرعوب اور ہیبت زدہ ہوگئیں اور مسلمانوں کے حوصلے اتنے بلند ہوگئے کہ بڑے سے بڑا طاقتور صاحبِ اقتدار بھی انکی نظر میں ہیچ تھا۔

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خود حضرت معاویہ اور سیّدنا علی رضی اللہ عنہما میں مقابلہ شروع ہوگیا تو شکست خوردہ قیصرِ روم نے اس خانہ جنگی کو اپنے لیے فالِ نیک سمجھا۔ اُس نے "جنودِ عظیمہ" بڑی بڑی فوجیں جمع کیں اور اچانک حملہ کرنے کے لیے مملکتِ اسلامیہ کی سرحد کے قریب پہنچ گیا۔ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جیسے ہی معلوم ہوا قیصر کو ایک تہدید آمیز خط لکھا۔ مضمون خط سے زیادہ خط کا انداز ملاحظہ فرمایئے۔ مملکت اسلامیہ کا ایک گورنر شہنشاہِ روم کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے اور کس طرح خطاب کر رہا ہے۔

اولعین۔ واپس لوٹ جا۔ اگر تو اپنے ملک کی طرف واپس نہ لوٹا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیرے مقابلہ پر میں اور میرے ابن عم (حضرت علی رضی اللہ عنہ) صلح کرلیں گے۔ پھر میں تجھ کو تیرے اپنے شہروں سے بھی نکال دونگا اور زمین کی تمام وسعت کو تجھ پر تنگ کر دونگا۔ حافظ عماد الدّین ابن کثیر نے مکتوبِ گرامی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔

واللہ لئن لم تنته ولم ترجع الی بلادك یا لعین لاصطلحن انا وابن عمی علیك ولاخرجنك من جمیع بلادك ولاضیقن علیك الارض بما رحبت۔

(البدایہ والنہایہ ص ۱۱۹۔ ج ۸)

مرکز کے قابو میں نہ رہے

اب یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مرکز کے قابو میں نہ رہے۔ (ص ۱۱۵۔ خلافت و ملوکیت)
تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہونا ان کے لیے ممکن ہوگیا۔ (ص ۳۲۶۔ خلافت و ملوکیت)

تو حقیقت یہ ہے کہ مقابلہ امیر المؤمنین سیّدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نہیں تھا۔ یہ تو اُن میں سے تھے جن کے متعلق کلام الٰہی نے بشارت دی ہے۔

ان المتقین فی جنات وّعیون ادخلوها بسلام اٰمنین ونزعنا ما فی صدورهم من غلّ اخواناً علیٰ سررٍ متقابلین لا یمسهم فیها نصبٌ وما هم منها بمخرجین۔

(سورہ ۱۵۔ حجر آیت ۴۵۔ ۴۶)

(متقی حضرات باغات میں ہوں گے جن میں چشمے بہہ رہے ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ سلامتی کے ساتھ اُن میں داخل ہو جاؤ۔ ہر طرح کا امن واطمینان اُن کو میسر ہوگا اور ان کے دِلوں میں کچھ رنجش تھی وہ ہم نے نکال دی۔ وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر (جلوہ افروز) ہوں گے وہاں نہ کسی طرح کا صدمہ اُن کو چھُو سکے گا۔ اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔)

مقابلہ تھا اہلِ شام کا اور عراق کے اُن شورہ پشتوں کا جن کا نصب العین تخریب تھا۔ جنہوں نے سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ کیا۔ یہاں تک کہ ان کو شہید کر دیا۔ پھر سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے مار آستین بن گئے۔

پھر ان سے ہی تعلق رکھنے والا بڑا عنصر خارجی ہو گیا جو اپنے سوا ہر ایک مسلمان کو واجب القتل کافر سمجھتا تھا جو اگرچہ سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں تباہ ہوا، مگر ظاہر ہے امیر المومنین سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بھی بہت بڑی طاقت کو بے محل صرف کرایا۔ (اختصار یہ ہے تفصیلات کتابوں کے سینکڑوں صفحات میں ملاحظہ فرمائیے)

نئے لوگوں کی شرکت اور ان کی پیش روی

سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اصرار پر خلیفۂ سوم امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بحری جنگ کی اجازت دی لیکن بظاہر خلیفۂ دوم فاروق اعظم کی پالیسی کا احترام کرتے ہوئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ اپنی طرف سے کسی کو منتخب یا نامزد نہ کریں۔ نہ قرعہ اندازی سے محاذ پر جانے والوں کو طے کریں، بلکہ ان کو پورا اختیار دے دیں جو اپنی خوشی سے غزوہ کرنے اور محاذ پر جانے کو طے کرے اس کے لیے سامان فراہم کریں اور اسکو مدد دیں۔

(طبری ص ۵۲ - ج ۵)

اس ہدایت کے نتائج دور رس ہوئے۔ بہت سے وہ آگے آگئے جن کا پہلے وجود بھی نہیں تھا۔ ◆◆

اِعلان

حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب دین پوری مدظلہ، ۱۳ ربیع الاوّل مطابق ۲۸ اپریل کو جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور میں نماز جمعہ سے قبل تقریر فرمائیں گے اور ۲۸ اور ۲۹ اپریل کی درمیانی شب کو جامع مسجد کرشنا گلی بانسانوالہ بازار لاہور میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر تقریر فرمائیں گے ــــ (مولانا) شیر محمد سرگودھوی

احسان دانش

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حُسنِ فطرت کو ہجومِ عاشقاں درکار تھا
عاشقوں کو بہرِ سجدہ آستاں درکار تھا

زندگی تھی چلچلاتی دُھوپ میں زار و زبوں
رہروؤں کو سایۂ ابرِ رواں درکار تھا

بحر کو موتی ملے، تاروں کو تنویریں ملیں
اس سخاوت کو شہِ ہر دو جہاں درکار تھا

اس بساطِ خاک کی نشو و نما کے واسطے
اِک حکیمِ آب و گل اِک چارہ خواں درکار تھا

کُفر کے نرغے میں گھبرائی ہوئی مخلوق کو
ذاتِ برحق کا یقینِ بے گماں درکار تھا

اے زہے تقدیر یہ نکلا محمدؐ کا مقام
کوئی انسان و خدا کے درمیاں درکار تھا

خالقِ ہر دو جہاں کی مصلحت جو ہو سو ہو
اس جہاں کو ناقدِ دانشوراں درکار تھا

خامیٔ مخلوق سے خالق پہ اک آتی تھی بات
عاصیوں کو اک شفیعِ عاصیاں درکار تھا

قافلے کو منزلِ انسانیّت کے واسطے
نسلِ انساں سے امیرِ کارواں درکار تھا

بے صدا و صوت تھی دولت سرائے آب و گل
اس فضا میں صرف آئینِ اذاں درکار تھا

چاہیے تھا آدمی کی رہبری کو آدمی
مرسلوں کو سربراہ مرسلاں درکار تھا

زندگی پر کیسے کھُل جاتے رموزِ زندگی
قولِ حق کو ان کا اندازِ بیاں درکار تھا

منجمد تھی کب سے صحرائے عرب میں تیرگی
حق نے پیغمبر وہیں بھیجا جہاں درکار تھا

نُور اُن کا عرش پر مولود اُن کا خاک پر
آسمانوں سے زمیں کو ارمغاں درکار تھا

اے محمدؐ تو نے رکھ لی مسلکِ آدم کی لاج
جسکو دانائے دو حرفِ کن فکاں درکار تھا

ان سے ملتے ہی نظر کافر مسلماں ہو گئے
اس کے معنی ہیں حرم کو پاسباں درکار تھا

دُھوپ میں ڈھوئے تھے پتّھر اسلیے سرکار نے
حشر کے دن رحمتوں کا سائباں درکار تھا

رحمۃ للعلمینی سے جلے دل کے چراغ
انس و جاں کو خیر خواہِ انس و جاں درکار تھا

سچ تو یہ ہے اس خدائے دو جہاں کے واسطے
بزمِ عالم میں رسول دو جہاں درکار تھا

(قسط : ـــــ ۴) (سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو شمارہ نمبر ۹)

دُعا کی افادیت و اہمیّت

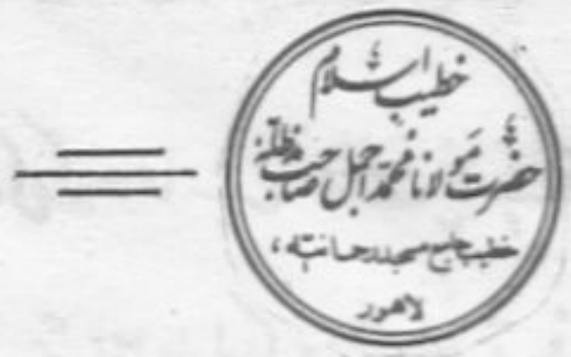

آدابِ دُعاء

ادب | وَيَفْتَتِحُ بِالتَّحْمِيْدِ وَالصَّلٰوةِ وَيَخْتِمُ بِهِمَا لِكَوْنِهِمَا مَقْبُوْلَيْنِ فَلَا تُرَدَّ حَاجَتُهٗ فِي الْبَيْنِ (عین العلم)

(ترجمہ) (اور آدابِ دُعاء سے ایک یہ ہے کہ دعاء کو حمد اور درود شریف سے شروع کرے اور ان ہی پر ختم کرے۔ اس لیے کہ حمد و درود ہر دو اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ مقبولیت رکھتے ہیں۔ پس ان کے درمیان واقع ہونے والی دعاء رد نہیں کیجاتی۔

تشریح | امام غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ دعاء کو خدا کی حمد و ثناء سے شروع کرے۔ اول ہی اپنی حاجت کو پیش کرنا شروع نہ کر دے۔

اور زین الحلم (ص ۱۰۲۔ ج ۱) میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ دعاء مانگنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرے جیسا کہ سورۃ فاتحہ میں پہلے خدا تعالیٰ کی حمد واقع ہوئی ہے۔ نیز حدیث شریف میں بروایت سلمہ بن اکوع رضؓ وارد ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم دعاء مانگنے سے پہلے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلَى الْوَهَّابِ فرمایا کرتے تھے۔

تفسیر مراح لبید (ص ۲۴۷، ج ۲) میں آیت ربنا وسعت کل شئ رحمۃ وعلما فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلك وقهم عذاب الجحیمِ۔

(ترجمہ) اے رب ہمارے آپ کی رحمت اور آپ کا علم ہر چیز کو شامل ہے۔ سو آپ ان لوگوں کو جو توبہ کر چکے ہیں اور آپ کی راہ پر چلتے ہیں بخش دیجیے اور نیز ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجیے۔ اس آیت کریمہ کے تحت

فرماتے ہیں۔

ھذا دلیل علی ان السنۃ فی الدعاء ان یبدأ فیہ بالثناءِ علی اللہ ثم یدعو عقیبہ فان الملائکۃ لما عزموا علی الدعاء للمؤمنین بدؤوا بالثناءِ فقال ربنا وسعت کل شئ وعلماً۔

(ترجمہ) یہ دلیل ہے اس بات کی کہ دعاء میں سنت یہ ہے کہ دعاء کو حمد باری تعالےٰ سے شروع کیا جائے اس کے بعد اپنے مطلب کو پیش کیا جائے اس لیے کہ حاملینِ عرش فرشتوں نے جب مومنین کے لیے دعاء مانگنے کا عزم کیا تو پہلے خدا تعالےٰ کی حمد وثنا بیان کی چنانچہ انہوں نے کہا اے پروردگار ہمارے آپ کی رحمت اور آپ کا علم ہر چیز کو شامل ہے۔

نیز حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دعا مانگے اسے چاہیئے کہ پہلے مجھ پر درود بھیجے، کیونکہ درود کی قبولیت تو ضروری ہے اور اللہ تعالےٰ کے کرم سے یہ بعید ہے کہ دو دُعاؤں میں سے ایک کو قبول فرمالے اور دوسری کو رد فرمادے۔

اور ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی کوئی حاجت اللہ تعالےٰ سے مانگنی چاہے تو پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے پھر اپنی حاجت مانگے اور خاتمۂ دعاء بھی درود پر کرے۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دُعاء کے اول و آخر درود کو تو قبول فرمائیں گے اور ان کے کرم سے یہ بعید ہے کہ درمیانی بات کو رد فرمادیویں۔

(زین الحلم ص ۱۰۲، ۱۰۳۔ جلد ۱)

امام شعرانی رح فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں دعاء کے وقت اپنی حاجت پیش کرنے سے پہلے ہم کو خدا تعالےٰ کی حمد وثناء اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا اہتمام ضرور کرنا چاہیئے اور حاجت پیش کرنے سے پہلے حمد اور درود شریف بمنزلہ ہدیہ کے ہوگا اور حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ مقاصد میں کامیابی کی کنجی دعاء سے پہلے حمد وثنا و درود سلام ہے پس جب ہم خدا کی حمد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہونگے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجیں گے تو آپ بارگاہ ایزدی میں ہماری حاجت کے پورا ہونے کے لیے سفارش فرمائیں گے۔

لانسئل اللہ تعالے شیئا اِلا بعد ان نحمد اللہ تعالی ونصلی علی النبی صلے اللہ علیہ وسلم وذالک کالھدیۃ بین یدی الحاجۃ - وقد قالت عائشۃ رض مفتاح قضأ الحاجۃ - الھدیۃ بین یدیھا - فاذا احمدنا اللہ تعالے رضی عنا - واذا صلینا علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم شفع لنا عند اللہ فی قضاءِ تلک الحاجۃ - (لواقح الانوار القدسیہ ص ۲۸)

حمد باری تعالےٰ کے فضائل

(۱) عن جابر رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الذکر لا اِلٰہ الا اللہ وافضل الدعاء الحمد للہ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت جابر رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے اور خدا کو پکارنے کا سب سے افضل کلمہ الحمد للہ ہے۔ (ترمذی - ابن ماجہ)

فائدہ: ترجمان السنۃ (ص ۵۶، ج ۲) میں اس حدیث کے فوائد وحواشی میں لکھتے ہیں کہ الحمد للہ کا افضل دعاء ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دعاء کا لفظ عربی زبان میں اردو کے استعمال سے ذرا جداگانہ ہے۔ عربی میں دُعاء کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے پکارنے کو کہتے ہیں اور اس ذات بے نیاز کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس کی تعریف سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں اسی لیے سورۃ فاتحہ کو الحمد للہ سے شروع کیا گیا ہے۔

(۲) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ کو اپنی تعریف بہت پسند ہے۔

(۳) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر دنیا ساری میری امت میں کسی کے ہاتھ میں ہو اور وہ الحمد للہ کہے تو یہ کہنا اس سے افضل ہے۔

ؔ زبان پہ کیا ہو تیری حمد اور ثناء کے سوا
مجھے تو کچھ نظر آتا نہیں فنا کے سوا (اکبر مرحوم)

حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے تخت پر پرواز کر رہے تھے۔ جب تخت سلیمانی پر ایک کسان کی نگاہ پڑی تو فرطِ حیرت سے پکار اٹھا سبحان اللہ لقد اوتی آل داود ملکا کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت داود علیہ السلام کی اولاد کو کیسی بہترین سلطنت سے نوازا ہے۔ سبحان اللہ۔ کسان کا یہ جملہ معجزانہ طور پر بذریعہ ہوا آپ تک پہنچا۔ تو آپ نے تخت اتارا اور کسان کو بلا بھیجا اور فرمایا۔ مَاذَا قُلْتَ ؟ تو نے ابھی کیا کہا تھا۔ تو اس نے

عالم حیرت میں جو جملہ کہا تھا (سبحان اللہ) اس کا آپ کے سامنے اعادہ کیا۔ تو حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ لتسبیحۃ واحدۃ یقبلہا اللہ تعالٰی خیر مما اوتی اٰل داؤد۔ ایک بار سبحان اللہ کہنا جس کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت بخشا ہو تو یہ تسبیح بارگاہ خداوندی سے جو کچھ آل داؤدؑ کو عنایت کیا گیا ہے۔ اس سے بہتر ہے۔

پس از سی سال این معنے محقق شد با خاقانی (روح المعانی ص۱۷۵ سورۃ نمل)

کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

درود شریف کے فضائل درود شریف کے فضائل میں تو علماء کرام کی مستقل تصانیف موجود ہیں۔ یہاں انکو درج کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مختصراً اتنی بات کہے دیتا ہوں کہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم رحمتِ دوجہاں ہیں۔ ان کے ساتھ جس قدر تعلق ہوگا اسی قدر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور حدیث شریف میں وارد ہے آپ نے ارشاد فرمایا میرے ہاں زیادہ مقرب تم میں سے وہ شخص ہے جو مجھ پر زیادہ درود پڑھے۔

بریقہ محمودیہ شرح طریقہ محمدیہ ص۴۶، ج ۴ میں فرماتے ہیں۔ النبی وسیلۃ الی اللہ تعالٰی والصلوٰۃ افضل الوسائل الی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کا بہترین وسیلہ درود شریف ہے

اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے بعض عارفین سے نقل کیا ہے کہ درود شریف کے ذریعے بلا واسطہ شیخ و مُرشد قرب الٰہی نصیب ہو جاتا ہے، کیونکہ درود شریف کے ذریعے سے ذات نبوّت سے براہ راست تعلق پیدا ہو جاتا ہے بخلاف دوسرے اذکار کے کہ ان میں شیطان کی مداخلت سے بچنے کے لیے شیخ و مرشد سے تعلق ضروری ہے۔ ورنہ اُن اذکار کی برکت سے محرومی ہوتی ہے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ قول جمیل میں فرماتے ہیں مجھے میرے والد صاحبؒ نے روزانہ درود شریف پر مداومت کرنے کی وصیت فرمائی اور انہوں نے فرمایا کہ ہم نے جو کچھ بھی پایا وہ اسی درود شریف کی وجہ سے پایا۔ الفاظ یہ ہیں بہا وجدنا ما وجدنا۔

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک صحابی ابی بن کعبؓ نے حضورِ انور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں سارا دن جناب پر درود ہی پڑھتا رہوں۔ آپ نے فرمایا اگر تو نے یوں کر لیا تو تیری ساری پریشانیاں دُور

ہو جائیں گی اور تیرے گناہ بھی معاف ہو جائیں گے۔

(نوٹ) درود شریف کے فوائد کا جامع بیان لواقح الانوار القدسیہ ص ۲۸۶ میں اور ابن القیم کی جلاء الافہام اور سخاوی کی القول البدیع میں ملاحظہ فرمائیں۔

اکبر مرحوم نے اپنے کلام منظوم میں کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو کر دے سما اُبھار کر اکبر اسی کا وِرد تو شوق سے بے شمار کر

صلّ علیٰ محمّدٍ صلّ علےٰ محمّدٍ

حالتِ ملک و قوم پر ہوں شب و روز بے قرار دین سے دل کو پھیر دے ایسے سبب ہیں بے شمار
مرکزِ طبع کیا بنے جس سے ہو کم یہ انتشار آئی صدا فلک سے یہ پڑھ تو اسی کو بار بار

صلی علیٰ محمّد صلِّ علےٰ محمّدٍ

ادب ویقدم ربنا خمسا فور دفیہ فاستجاب لھم ربھم (آیۃ ۱۹۵، آل عمران)

(ترجمہ) آداب دعاء سے ایک یہ ہے کہ دعاء سے پہلے لفظ ربّنا کو پانچ بار کہے۔

چنانچہ (قرآن مجید میں) وارد ہوا ہے۔ پھر ان کے پروردگار نے انکی دُعاء قبول فرمالی۔

تشریح قرآن مجید میں جس قدر دعائیں وارد ہوتی ہیں وہ اکثر و بیشتر ربِّ و ربنا کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں اور اس کا فلسفہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ دعاء مانگنے والا اللہ تعالےٰ کی بارگاہ عالیہ میں اس کی صفت ربوبیت کو قبولیت دعاء کے لیے بطور وسیلہ کے پیش کرتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا یہ عالم ہے کہ وجود بخشنا۔ نیست سے ہست بنانا اور عدم سے وجود میں لانا پرورش کے تمام بیرونی وسائل اور اندرونی ذرائع جمع کرنا اور ہر ایک شئے کو اس کی فطرت کے مطابق مواہب عطا کرنا، یہ اسکی شان ربوبیت کے ہی کرشمے ہیں۔

پانی میں تیرنے والے، ہوا میں اڑنے والے، زمین پر رینگنے والے، زندگانی کا سانس رکھنے والے خاکی، ناری، نوری، کروبی سب کے سب ہر آن، ہر لحظہ اسکی ربوبیت سے مستفید ہو رہے۔ غرضیکہ ہر شخص اور ہر چیز اس کی پروردہ

ہے اور وہ سب کا پروردگار ہے۔ فتبارك الله رب العٰلمین

ملا علی قاریؒ اربعین نوویہ کی شرح المبین المعین لفہم الاربعین صـ۸۶ پر فرماتے ہیں

واخرج البزار مرفوعاً اذا قال العبد یارب اربعاً قال الله لبیك یاعبدی سل تعطه - ولذا غالب ادعیة القرآن مصدرة بذکر الرب فان نعت الربوبیة یناسب حالة العبودیة وقد قال جعفر الصادقؒ من حزنه امر فقال خمس مرات ربنا نجاهُ الله مما یخاف واعطاه ما اراد - لانّ الله تعالیٰ حکیٰ عنهم فی اٰخر اٰل عمران انهم قالوه خمسا ثم قال فاستجاب لهم ربهم۔

(ترجمہ) بزارؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ بندہ جب چار دفعہ "یارب" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں - لبّیک - اے میرے بندے مانگ کیا مانگتا ہے کہ تجھے عطا کیا جائے اور اسی وجہ سے قرآن مجید کی اکثر دعائیں لفظ ربّ وربّنا سے شروع ہوتی ہیں، کیونکہ صفت ربوبیت کا ذکر کرنا بندہ کی شان عبودیت کے زیادہ مناسب ہے۔

اور حضرت جعفر صادقؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی پریشانی میں مبتلا ہو تو پانچ بار یاربّنا کہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس چیز سے جس کا وہ خوف رکھتا ہے امان بخش دیتے ہیں اور جو چیز وہ چاہتا ہے اسکو عطا فرما دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے سورۃ آل عمران کے آخر میں ان دانشمند حضرات کی دعوات کو نقل فرمایا ہے جن میں انہوں نے پانچ بار (ربنا ماخلقت هذا باطلا) تو ان کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے پروردگار نے انکی دعاء کو قبول فرمایا۔

ادب | ویقدم حاجة الاٰخرة لتسارع النجاح (عین العلم)

ترجمہ: اور آدابِ دعاء سے ایک یہ ہے کہ اخروی حاجت کو دنیوی حاجت پر مقدم کرے تاکہ جلدی کامیابی سے بہرہ ور ہو۔

تشریح | زین الحلم شرح عین العلم۔ ص ۱۰۳، ج ۱۔ میں اس قول کے تحت لکھتے ہیں کہ مانگنے میں حاجتِ آخرت کو مقدم رکھے۔ لقوله علیه السلام اللّٰهم لاتجعل الدنیا اکبر همنا۔ (اے اللہ! دنیا کو ہمارا مقصد اعظم نہ بنا) باقی آیت کریمہ۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة وقنا عذاب النار۔

(ترجمہ: اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بھی خیر و خوبی عطا فرما اور آخرت میں بھی خوبی و بھلائی عطا، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ)

اس کے منافی نہیں، کیونکہ حسنہِ دُنیا سے مراد وہ نیکیاں اور خوبیاں ہیں جو آخرت میں کام آئیں۔ اب اس آیت کریمہ کے متعلق تفسیر ماجدی۔ ص ۸۰ کے فوائد و حواشی ملاحظہ ہوں۔ مؤمنین کی دُعائیں، مناجاتیں، آرزوئیں، دنیاد آخرت دونوں کی فلاح و بہبود کی جامع ہوتی ہیں۔ حَسَنَۃً وہ طاعت ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ و بہتر ہے اور اس کے اندر ہر قسم کی خیر و خوبی آگئی۔ دنیا میں حسنۃ توفیق خیر ہوئی اور آخرت میں حسنۃ ثمرۂ خیر (بحوالہ قرطبی)

ایسی جامع و ہمہ گیر دُعاء سے ادیان و ملل کے صحیفے خالی ہیں۔ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم خود اس دعاء کی کثرت رکھتے تھے۔ (بحوالہ بخاری و مسلم)

مال، اولاد، صحت، اطمینان وغیرہ جو چیزیں بھی تحصیلِ خیر میں معین ہو سکتی ہیں۔ خواہ وہ بظاہر دنیوی اور مادی ہوں۔ سب مؤمن کا مقصود و مطلوب بن سکتی ہیں۔ البتہ خود دنیا ہرگز کسی مؤمن کا مدعا اور مقصود نہیں بن سکتی ہے۔ آیت کی ترکیب خوب نظر میں رہے۔ الخ

مراد محض یہ ہے کہ ہمیں تو آپ کے دربار سے صرف بھلائی یا بہتری درکار ہے۔ دنیا میں ہو تو بھی اور آخرت میں ہو تو بھی۔ مزید تفسیر یہ کہ دنیا میں ہمیں اعمال خیر عنایت ہوں اور آخرت میں ثمراتِ خیر۔ بعض نادان اور سطحی دماغ والے اہلِ قلم نے آیت سے عجیب غریب نتیجہ نکالا ہے کہ آخرت کی طرح دنیا بھی مؤمن کا مقصود بن سکتی ہے۔ بلکہ قرآن مجید خود طلبِ دنیا کی ترغیب و تعلیم دیتا ہے۔ تعالیٰ اللہ علوا کبیرا۔ مغالطہ کی قلعی اوپر کھولی جا چکی ہے۔ مادہ پرست قوموں کی دنیا طلبی اور دنیا پسندی سے مرعوب ہو کر خود مسلمانوں کو طلب دنیا کی تعلیم دینا۔ بلکہ اسے قرآنی تعلیم قرار دینا خدمتِ اسلام کی عجیب و غریب صورت ہے۔

رحمۃ القدوس شرح بخاری۔ ص ۱۴۲، ج ۱۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی منقول ہے۔

من بدأ بحظہ من آخرتہ نال من آخرتہ ما ارادہ ولم یفتہ من دنیاہ ما قسم لہ

(ترجمہ) جو شخص اپنی آخرت کے حصہ کو (دنیا پر) مقدم کریگا وہ آخرت سے اپنی مراد پالے گا اور دُنیا سے جتنا حصہ اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ بھی فوت نہ ہوگا۔

آیات و احادیث اس مضمون میں بکثرت وارد ہیں۔ حاجات اُخرویہ میں رغبت کرنا حقیقی ایمان ہے۔ ◆◆

جناب گوہر ہوشیارپوری

نعت

غایتِ خلقِ شش جہات صلِّ علیٰ محمّدٍ
چہرہ کشائے کائنات صلِّ علیٰ محمّدٍ

آپ حبیبِ کبریا آپ نقیبِ لا اِلٰہ
نقش گرِ حریم ذات صلِّ علیٰ محمّدٍ

تاجوروں کے تاجور دادگروں کے دادگر
آپ صفات در صفات صلِّ علیٰ محمّد

آپ کی مدح کو خُدا آپ ہے درپے ثناؔ
آپ ہیں در خور صلوٰۃ صلِّ علیٰ محمّدٍ

آپ رسولِ مرسلین آپ شفیعِ مذنبین
آپ ذریعۂ نجات صلِّ علیٰ محمّدٍ

آپ کا علم بے مثیل آپ کا حلم بے عدیل
مظہرِ صد تجلّیات صلِّ علیٰ محمّدٍ

وجۂ ہزار انبساط گوشۂ چشمِ التفات
رازِ شکستِ مشکلات صل علیٰ محمّدٍ

○

محترم محمود احمد عارفؔ

غزل

پھول دو دن بہار دو دن ہے
رونقِ بزمِ یار دو دن ہے

ہوش کر ہوش اے دلِ ناداں
زندگیٔ مستعار دو دن ہے

نازِ ساقی کا ٹوٹ جائے گا
میکدے کی بہار دو دن ہے

حُسن، جوبن، نکھار کچھ بھی نہیں
یہ پھبن یہ بہار دو دن ہے

غمزہ و عشوہ و ادا پہ نہ مر
یہ تبسّم یہ پیار دو دن ہے

کھیل کھُل کر نہ کھیل دُنیا میں
یہ فضا سازگار دو دن ہے

دیکھ انجامِ فصلِ گل عارفؔ
عمر ناپائیدار دو دن ہے

○

الشفاء بتعریف حقوقِ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

مولفہ: قاضی ابو الفضل عیاض بن موسیٰ الاندلسی
مترجمہ: محترم نور محمد صاحب غفاری ایم اے، بہاولنگر

اللہ تعالیٰ کا نام لے کر "الشفاء" کا ترجمہ شروع کیا ہے جو بالاقساط "انوار مدینہ" میں چھپتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔

اِس رسالہ میں پہلی فصل کا ترجمہ حاضر ہے۔ چند ابتدائی عنوانات چھوڑ کر اصل موضوع سے ترجمہ شروع کیا ہے۔ (نور محمد غفاری)

الباب الاوّل

فی ثناء اللہ تعالیٰ علیہ واظہارہ عظیم قدرہ لدیہ۔

(نبی اکرمؐ کے لیے اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اللہ کے نزدیک آپکی عظیم قدر و منزلت کے اظہار کے بارے میں)

اللہ تعالیٰ کی کتاب عزیز میں واضح آیاتِ کریمہ ہیں جن میں جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کا ذکر مبارک بطریقِ احسن کیا گیا ہے، آپ کے محاسن گنائے گئے ہیں۔ آپ کے معاملہ کو عظمت دی گئی ہے اور آپ کے وقار کو بلند کیا گیا ہے۔ (ایسی آیات بے شمار ہیں مگر) ہم نے صرف انہی آیات کا انتخاب کیا ہے جن کے معانی ظاہر اور مفہوم واضح ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کو ہم نے دس فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلی فصل

(اس فصل میں ایسی آیاتِ کریمہ ہیں جن میں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وستائش کی گئی ہے اور آپ کی خوبیاں شمار کی گئی ہیں)

پہلی آیت | لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (البتہ آیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم)

حضرت شیخ ابو اللیث سمرقندیؒ کہتے ہیں: "بعض قراء نے اَنْفُسِكُمْ کو اَنْفَسِكُمْ (یعنی تمہارے نفیس ترین لوگوں میں سے) پڑھا ہے۔ یعنی لفظ اَنْفُسِكُمْ کی "ف" کو مفتوح پڑھا۔ مگر جمہور کی قرأت اَنْفُسِكُمْ ہے۔"

فقیہہ قاضی ابوالفضلؒ، اللہ انہیں توفیق بخشے، فرماتے ہیں: "اللہ تعالےٰ نے اس آیتِ کریمہ — لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ — میں مؤمنین یا صرف عربوں یا عربوں میں اہلِ مکّہ یا دنیا کے تمام انسانوں (بلا تمیز رنگ و نسل اور کافر و مؤمن) — جیسے کہ مفسرینؒ نے اس آیت کے مخاطب کے سلسلہ میں اختلاف کیا ہے — کو بتایا ہے کہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ان کی طرف بھیجا ہے۔ جسے یہ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس کے مقام و مرتبہ کو پہچانتے ہیں اور اس کی صداقت اور امانت کو جانتے ہیں۔ یہ لوگ آپ پر نہ جھوٹے ہونے کا الزام دھر سکتے ہیں نہ قوم کے بدخواہ ہونے کا۔ کیونکہ آپ انہی لوگوں میں سے تھے (لہٰذا آپ سے اپنے ابنائے جنس کی بدخواہی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا)۔ اور (علم الانساب کے ذریعہ سے پتہ چلتا ہے کہ) عربوں کا کوئی ایسا قبیلہ نہیں جسے جناب صلی اللہ علیہ وسلّم سے نسبت یا قرابت نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کے نزدیک اللہ تعالےٰ کے فرمان لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ — میں أَنفُسِكُمْ کے معنی تو قرابت کی محبّت کے ہیں مگر جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسل کا تعلّق ہے آپ عرب قبائل میں سے اشرف، اعلیٰ اور افضل لوگوں میں سے تھے (جن قراءؒ نے أَنفَسِكُمْ پڑھا ہے ان کے نزدیک اس آیت کریمہ کا یہی مذکورہ بالا مفہوم درست ہے) اور یہی انتہائی درجہ کی تعریف ہے۔ اللہ تعالےٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اوصافِ حمیدہ سے متصف کیا اور اوصافِ پسندیدہ کے ساتھ آپ کی ستائش فرمائی۔

وہ خوبیاں کیا ہیں؟ ان خوبیوں میں سے انسانوں کے ہدایت یافتہ ہونے اور ان کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے بارے میں آپ کا حریص[1] ہونا ہے۔ اور جو تکلیف انسانوں کو دنیا میں اٹھانی پڑتی ہے یا جو نقصان (اپنی بداعمالی کی وجہ سے) آخرت میں اٹھائیں گے اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاق[2] ہوتا ہے اور ایمانداروں کے معاملہ میں آپ کا مشفق[3] اور رحمدل[4] ہونا ہے[1]۔ بعض مفسرینؒ نے کہا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو اپنے مبارک ناموں میں سے دو نام عطا فرمائے ہیں وہ رؤف (شفیق) اور رحیم (مہربان) ہیں۔

اس آیت کی دیگر مثالیں قرآن حکیم میں اس آیتِ کریمہ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ کی مثالیں قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر ملتی ہیں مثلاً:

---

[1] ان چاروں صفات کا ذکر قرآنِ مجید کی آیت لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ) میں کیا گیا ہے۔

(ا) لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران)

البتہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسانِ عظیم فرمایا جب اس نے انہی کی جنس کا ایک رسولؐ ان میں (ان کی ہدایت کیلئے) مبعوث فرمایا

(ب) هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (الجمعۃ : ۱)

وہی تو ہے جس نے ان ناخواندہ لوگوں میں سے ایک کو رسول بنا کر ان کی طرف بھیجا۔

(ج) كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ (البقرہ) جیسا کہ ہم نے بھیجا تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بنا کر۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اللہ تعالےٰ کے ارشاد مِنْ اَنْفُسِكُمْ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ میرا انسانوں سے نسبی، قرابتی اور خاندانی شرافت کا تعلق ہے اور میرے آباء و اجداد میں حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر کوئی زانی نہیں، بلکہ سب نے نکاح کیا۔

حضرت ابنِ قلبیؒ کہتے ہیں : "میں نے (سلسلہ در سلسلہ نسب شمار کرتے ہوئے) جناب صلی اللہ علیہ وسلّم کی پانسو مائیں شمار کیں مگر میں نے ان میں سے کسی ایک کو نہ کبھی زانیہ پایا نہ اس میں زمانۂ جاہلیت کی خباثتوں کو پایا۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اللہ تعالےٰ کے ارشاد،

تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ پھرنا آپ کا بیچ سجدہ کرنے والوں کے

(الشعراء : ۲۱۹) (از شاہ رفیع الدین)

کی شرح میں فرماتے ہیں : (یہاں "ساجدین" سے مراد انبیا ہیں) آپؐ کا سلسلہ نسب ایک نبی (حضرت ابراہیم علیہ السلام) سے دوسرے نبی (حضرت اسماعیل علیہ السلام) تک جاتا ہے۔ حتّٰی کہ آپؐ کو بھی اللہ تعالےٰ نے نبی بنا کر بھیجا۔"

(یعنی آپؐ خود نبی ہیں اور انبیاء کی اولاد ہیں واللہ اعلم)

نبی کے انسان ہونے میں مصلحت

اللہ تعالےٰ یہ جانتے تھے کہ (مخلوق بغیر رہنمائی کے) ان کی فرمانبرداری سے عاجز ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے انسانوں کو اس کمزوری کی خبر بھی دے دی تاکہ وہ جان لیں کہ وہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے اپنے اور انسانوں کے درمیان ایک ایسی مخلوق (رسول) پیدا کر دی جو انہیں انسانوں میں سے تھی جس کی شکل و صورت بھی انسانی ہی تھی۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اسے نرم دلی اور رحمت کا لباس پہنا دیا اور اسے انسانوں کی طرف اپنا ایلچی بنا کر بھیجا۔ پھر اس رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی فرمانبرداری کو اپنی فرمانبرداری سے تعبیر فرمایا

اور اس کی موافقت کو اپنی موافقت سے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی۔

(یہاں تک آپ کے ان محاسن کا تعلّق ہے جو پہلی آیۃ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ میں آئے تھے)

دوسری آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانبیاء : ۱۰۷)

(اور ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا)

حضرت ابوبکر محمد ابن طاہرؒ فرماتے ہیں: "اللہ تعالےٰ نے جناب صلی اللہ علیہ وسلّم کو رحمت کی زینت سے مزیّن کر دیا۔ آپؐ کی پیدائش، آپؐ کی تمام سیرت پاک اور آپؐ کی ہمہ قسم کی صفات انسانوں (بلا تمیزِ کافر و مومن) کے لیے رحمت ہیں۔ جس (خوش بخت) نے اس رحمت سے کچھ حصّہ پالیا (از روئے ایمان و قرب) وہ دنیا و عقبیٰ کی مکروہات سے نجات پاگیا اور تمام مرغوب نعمتوں سے بہرہ ور ہوگیا۔ ع این سعادت بزورِ بازو نیست

کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا، اللہ تعالےٰ قرآنِ مجید میں فرماتے ہیں :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے رحمۃ ہونے کی چند صورتیں مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی موت و حیات دونوں رحمت ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "میری زندگی تمہارے لیے باعثِ خیر و برکت ہے اور میری موت بھی۔" اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: "جب اللہ تعالےٰ کسی اُمّت کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس اُمّت کے نبی (علیہ السّلام) کو (ساری) اُمّت (کی موت) سے قبل وصال دیتے ہیں۔ اس طرح اس (وصال کرنے والے نبی) کو اُمّت کے لیے آخرت کا تعمیرِ منزل اور پیشرو بنا دیتے ہیں۔"

۲۔ حضرت علّامہ ابواللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں: "آپؐ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں اور آپؐ کی رحمت جنّوں اور انسانوں دونوں کو شامل ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ آپؐ تمام مخلوق کے لیے رحمت ہیں اس کی چند شکلیں ہیں :

(ا) مؤمن کے لیے رحمت اس لیے کہ آپؐ کے طفیل اسے ہدایت نصیب ہوئی (جس کے نتیجے میں وہ دونوں جہان میں کامیاب و کامران ہوگیا۔)

(ب) منافق کے لیے رحمت اس لیے کہ آپؐ کی برکت سے اسے قتل سے امان مل گئی۔ (چونکہ وہ زبان سے رسالت کا

اقرار کرنے والا ہے لہٰذا اسے دیگر کفّار کی طرح قتل نہیں کیا جاتا۔) (واللہ اعلم)

(ج) کافر کے لیے رحمت اس طرح کہ آپؐ کے وجودِ مبارک کی برکت سے اللہ کافروں کو دنیا میں عذاب نہیں دیتا۔ اور قرآن مجید کی آیت وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (جب تک آپ ان (کفّارِ مکّہ) کے درمیان تھے اللہ انہیں کیونکر عذاب دیتا۔ الانفال: ۳۳) میں اسی رحمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "آپؐ مومنین کے لیے رحمت ہیں اور کافروں کے لیے بھی۔ کیونکہ وہ کافر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو جھٹلانے کے باوجود اس (دردناک) عذاب سے عافیت پا گئے جس میں دوسری (انبیاء کو جھٹلانے والی) اُمّتیں مبتلا ہوئی تھیں"۔ اس مفہوم کی وہی آیت ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ۔ الخ)

۴۔ **حکایت جبریلؑ**: ایک دفعہ جناب صلی اللہ علیہ وسلّم نے جبرائیل علیہ السلام سے دریافت فرمایا: "کیا تم نے اس (میرے) رحمت (ہونے) سے کچھ پایا؟" جبرائیل علیہ السلام گویا ہوئے: "ہاں! میں اپنی عاقبت کے بارے میں خوف زدہ تھا، مگر جب اللہ تعالےٰ نے میری تعریف[1] فرما دی تو میں عذابِ آخرت سے مامون ہو گیا۔ وہ تعریف اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے:

ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ (التکویر: ع ۲)

طاقت ور ہے۔ عرش کے پاس ہی رہتا ہے۔ فرمانبردار ہے اور امانت دار بھی۔

۵۔ حضرت جعفر بن محمد صادقؒ اللہ تعالےٰ کے ارشاد سَلَامٌ لَّكَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِ کی تشریح میں روایت کرتے ہیں کہ سَلَامٌ لَّكَ سے مراد سَلَامٌ بِكَ (یعنی آپؐ ہی کی وجہ سے اصحاب الیمین یعنی اہلِ جنّت کے لیے

---

[1] اللہ تعالےٰ نے جبرائیل امین کی یہ تعریف اس وقت فرمائی جب قریش مکہ نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا کہ اگر آپ پر وحی آسمان سے نازل ہوتی ہے اور ایک فرشتہ لے کر آتا ہے تو وہ سلامت کب رہتی ہو گی؟ ممکن ہے لانے والا فرشتہ اس میں کمی بیشی کرتا ہو یا کوئی اس سے طاقتور فرشتہ یا جنّ اس میں اپنی رائے داخل کر دیتا ہو یا اللہ کی منشاء میں کمی کر دیتا ہو تو اللہ تعالےٰ نے جبرائیل امین کی مندرجہ بالا آیات میں تعریف فرمائی، چونکہ آپ کی رسالت اور وحی کی صداقت کیلیے جبرائیل کی تعریف کی گئی۔ لہٰذا یہ آپ ہی کی رحمت تھی۔ (واللہ اعلم۔ مترجم)

سلامتی ہے کیونکہ انہیں جو (دوزخ سے) سلامتی ملی ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اعلیٰ ترین بزرگی کی وجہ سے ہے (یعنی انہوں نے آپؐ کی پیروی کی، اللہ نے انہیں بخش دیا۔ واللہ اعلم۔ مترجم)

الغرض دوسری آیتِ کریمہ ۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی جو تعریف کی گئی ہے اس کا خاکہ مذکورہ بالا بیان میں کھینچا گیا ہے۔ مترجم)

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال اس طاق کی سی ہے جس میں چراغ رکھا ہو۔ وہ چراغ شیشہ کی قندیل میں رکھا ہو۔ وہ قندیل ایسا ہو جیسے چمکتا ہوا ستارہ جو مبارک درخت زیتون سے ضیاء پاتا ہے۔ اس کا تعلق مشرق سے ہے نہ مغرب سے۔ قریب ہے کہ اس کا تیل چمک اٹھے۔ قبل اس کے اسے آگ دکھائی جائے روشنی اوپر روشنی کے ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنے نور سے ہدایت دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شے کا علم رکھتے ہیں۔

حضرت کعب الاحبار رضؓ اور ابن جبیر کہتے ہیں "یہاں نورِ ثانی (یعنی نور الارض۔ زمین کا نور) سے مراد جناب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان "مَثَلُ نُوْرِهٖ" سے مراد بھی نورِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔

حضرت سہیل بن عبداللہ تستریؒ کہتے ہیں۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض کے معنی ہیں۔ اللہ آسمانی مخلوق (فرشتوں) اور زمینی مخلوق (جن وانس) کو ہدایت دینے والے ہیں۔ پھر فرمایا۔ جناب صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی مثال جب آپ اپنے باپوں (حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آپ کے والد ماجد تک کی صلبوں (پشتوں) میں تھے، طاق کی مانند تھی "مِصْبَاحٌ" (چراغ) سے مراد آپ صلے اللہ علیہ وسلم کا دل ہے اور "زُجَاجَةٌ" (قندیل سے مراد آپ کا سینہ مبارک ہے۔ گویا کہ وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے، کیونکہ اس میں ایمان اور حکمت کا نور بھرا ہوا ہے۔

"يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ (یعنی آپ کا سینہ مبارک درخت سے منوّر ہوتا ہے) یہاں "شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ"

سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نور ہے اور آپ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو "مبارک درخت" سے تشبیہ دی گئی ہے (یعنی آپ صلے اللہ علیہ وسلم بحیثیت اولاد ابراہیمی جناب خلیل علیہ السلام سے فیض یافتہ ہیں۔ یہ ہے خلاصہ کلام مترجم واللہ اعلم)

یَکَادُ زَیْتُہَا یُضِیْئُ۔ اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریب ہے کہ جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت لوگوں پر آپ کے کلام سے قبل عیاں ہو جائے۔ جیسے یہ (زیتون کا) تیل کہ آگ لگانے سے پہلے ہی چمکنے لگتا ہے۔ یعنی اس سے قبل کہ آپ دعویٰ نبوت کریں۔ لوگ قرآن و شواہد سے آپ کے نبی ہونے کا اندازہ کر لیں گے جیسے ورقہ بن نوفل اور بحیرہ راہب نے کیا۔ واللہ اعلم۔ مترجم)

حضرت قاضیؒ فرماتے ہیں کہ مفسرینؒ نے اس مندرجہ بالا آیت کریمہ کے مفاہیم کچھ اور بھی بیان کیے ہیں اللہ تعالےٰ نے اپنی مقدس کتاب میں اس آیت کے علاوہ اور دیگر مقامات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور اور روشن سورج کے پیارے ناموں سے پکارا ہے۔

ا نور کی مثال۔ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ (المائدہ: ۱۵)

البتہ آیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور[1] اور واضح کتاب (قرآن مجید)

ب چمکتے سورج کی مثال: ملاحظہ ہو۔

یٰٓاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝

(الاحزاب: ۴۵-۴۶)

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً ہم نے آپ کو لوگوں پر گواہ، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا، اللہ کی اجازت سے اللہ کی طرف پکارنے والا اور چمکتا ہوا سورج بنا کر بھیجا۔

چوتھی آیت اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۝ وَ وَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ ۙ الَّذِیْ

کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا؟ اور آپ سے وہ بوجھ اٹھا دیا جس نے آپ کی

۱۔ نور: میں قارئین کرام سے استدعا کروں گا کہ وہ نور بشر کے جھمیلوں میں نہ پڑ جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نورِ ہدایت ہیں اور آپ کی روح مبارکہ نور و نور ہے اس میں کیا شک ہے۔ (ن۔غ)

اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ (الم نشرح: ۱-۲-۳-۴)

پیٹھ توڑ رکھی تھی اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا۔

ا اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۔ کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھولدیا؟ مفسرینؒ کے متعدد اقوال ہیں:

(۱) شرح صدر سے یہاں وسعتِ قلب مراد ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ "آپ کے سینہ کو نور اسلام کے لیے کھولدیا۔"

(۳) حضرت حسن بصری فرماتے ہیں۔ "شرح صدر سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سینہ کو حکمت اور علم سے بھر دیا۔"

(۴) حضرت سہیل تستریؒ کہتے ہیں۔ "آپ کا سینہ مبارک نور رسالت کے لیے کھول دیا۔

(۵) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ" کے معنی ہیں۔ کیا ہم نے آپ کا سینہ پاک نہیں کر دیا کہ وہ وساوس کو بھی قبول نہیں کرتا؟"

ب وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ (اور ہم نے تجھ سے تیرا بوجھ اٹھا دیا جس نے تیری کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

(۱) بعض مفسرینؒ کہتے ہیں۔ "اس بوجھ سے مراد زمانہ جاہلیت کے کافروں کی خباثتوں (جو آپ کو سخت ناگوار گزرتی تھیں) کا بوجھ ہے۔

(۲) بعض دیگر حضرات نے کہا۔ "یہاں بوجھ سے (فرائض) نبوت کا بار مراد ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے اس کا حق ادا کر دیا۔" حضرت ماوردیؒ اور حضرت سلمیؒ نے یہ معنی بیان کیے ہیں۔

(۳) حضرت علامہ سمرقندیؒ حکایت کرتے ہیں کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ "ہم نے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھا اور اگر گناہوں سے ہمارا تحفظ آپ کو حاصل نہ ہوتا تو آپ کی پیٹھ گناہوں سے لد جاتی۔"

ج "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۔ اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا۔

(۱) حضرت یحییٰ بن آدمؒ کہتے ہیں۔ "آپ کو نبوت عطاء فرما کر آپ کا ذکر بلند کیا۔"

(۲) یہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں۔ "جب میرا ذکر ہوتا

ہے تو ساتھ تمہارا ذکر بھی، جیسے کلمہ طیبہ میں (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ)

(۳) یہ بھی مفہوم لیا گیا ہے کہ اذان اور اقامت کے کلمات میں اللہ تعالےٰ کے نام کے ساتھ جناب صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی آتا ہے۔ حضرت حسانؓ کیا خوب فرماتے ہیں۔ ضم اسم النبی مع اسمہ۔ اذ قال المؤذن فی الخمس اشہد اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا پاک نام اپنے مبارک نام کے ساتھ ملا لیا۔ جب مؤذن پانچ وقت اذان میں کہتا ہے۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ۔ اشہد ان محمد رسول اللہ۔ مترجم)

حضرت قاضی ابوالفضلؒ کہتے ہیں۔ مذکورہ بالا تقریر بلند وبالا نام والے اللہ تعالےٰ کی طرف سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو گرانقدر نعمتیں او بخششیں کی گئی ہیں ان کے بیان میں ہے اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی شرافت نفس اور بزرگی کے اظہار کے لیے کی گئی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے قبول ایمان اور نور ہدایت کے لیے آپ کے مبارک سینہ کو کھول دیا، علم (نبوت) کی یادداشت اور حکمت کے لیے آپ کے سینہ مبارک کو وسیع کر دیا، جاہلیت کے افعال کی (ناگواری اور ناپسندیدگی کی) کلفت آپ سے دُور کر دی۔[۱] آپ کے دل میں امور جاہلیت کے لیے بغض وعناد رکھ دیا گیا اور وہ بوجھ بھی آپ سے اٹھا لیا گیا جو (محسوس یا غیر محسوس طور پر) آپ کے کندھوں پر لاد دیا گیا تھا کہ آپ کا دین تمام ادیان پر غالب[۲] ہو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نبوت کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اس طرح کہ آپ نے (اللہ تعالےٰ کی توفیق سے) لوگوں تک وہ تمام احکامات پہنچا دیئے جو خداوند قدوس کی طرف سے ان کے لیے نازل ہوتے تھے اور اللہ تعالےٰ نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور جلالتِ مرتبہ بلندئ ذکر (قرآن مجید میں) نازل فرمائی ہے۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک نام کو اپنے مبارک نام کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں۔ خداوند قدوس نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک دنیا وآخرت دونوں میں بلند کیا۔ کوئی خطیب، کوئی شہادت دینے والا اور کوئی نمازی ایسا نہیں جو یہ نہ کہتا ہو۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی

---

[۱] یعنی ہدایت کی ہوائیں چلیں اور جاہلیت کا تار پود بکھر گیا۔ (واللہ اعلم) [۲]۔ قرآن مجید میں آتا ہے هوالذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ط وکفیٰ باللہ شہیداً۔ (سورۃ فتح ۲۸)

اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ ۔ معبود نہیں اور جناب صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

حضرت ابوسعیدن الخدری رضی اللہ عنہ کی روایت : حضرت ابوسعیدن الخدریؓ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے "آپ کا اور میرا پروردگار مجھ سے استفسار فرماتا ہے کہ اس نے آپؐ کا ذکر کیسے بلند فرمایا۔" تو میں نے جواب میں عرض کیا "اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ (اس سے زیادہ بلندیٔ ذکر کیا ہو سکتی ہے کہ) ان کا نام میرے نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔"

علامہ ابن عطاء کا فرمان :۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میں نے دین کی تکمیل اسی حال میں کی ہے کہ آپؐ کا ذکر میرے ذکر کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہی علامہ ابن عطاء ایک دوسرے مقام پر یوں کہتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میں نے اپنے نبی کی یاد کو اپنی یاد کے قائمقام قرار دیا۔" یعنی جو آپؐ کا ذکر کریگا وہ گویا میرا ذکر کریگا۔

حضرت جعفر بن محمدؒ صادقؒ کہتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب کوئی شخص جناب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ میرے رب ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار ہے، کیونکہ جو شخص جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی مانے گا اُسے ہی اللہ تعالیٰ سے ملنے کا یقین نصیب ہوگا ورنہ کافر، مشرک اور منافق کو یہ دولت کہاں نصیب۔" ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

بعض علماء نے کہا ہے کہ "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ سے آپؐ کے مقامِ شفاعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (یعنی آپؐ کو جو اُمّت کی شفاعت کرنے کی عزت ملی ہے وہ آپؐ کا آخرت میں ذکر بلند ہونے کی دلیل ہے) اور جہاں تک آپؐ کے ذکر کا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہونے کا تعلق ہے تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جنابؐ کی فرمانبرداری اور آپؐ کے نام (کے ذکر) کو اپنے نام کے ساتھ ملا دیا جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ (اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو) اور آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ (اور اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ) ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے پاک نام اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام کو مشترک واؤ عطف کے ساتھ جمع کیا گیا ہے اور جناب صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نام کو کلام میں اس طرح اکٹھا کرنا جائز نہیں

اسی اصول کی مثال وہ روایت ہے جو ہمیں حافظ شیخ ابو علی حسین بن محمّد جبّائی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے۔ یہ روایت ان احادیث میں سے ہے جس کی انہوں نے مجھے روایت کرنے کی اجازت دی ہے اور جسے میں نے ان (حضرت حسین بن محمد جبّائیؒ) کے معتمد علیہ تلامذہ سے سنا ہے۔ وہ کہتے ہیں مجھے حضرت ابُو عمر غرسیؒ نے وہ حضرت ابُو محمد ابن عبدالمؤمنؒ سے وہ حضرت ابو بکر بن داستہ رحمۃ اللہ علیہ سے وہ حضرت ابو داؤد سجزی سے وہ حضرت ابو الولید طیالسیؒ سے انہیں حضرت شعبہ حضرت منصور سے وہ عبداللہ بن یسارؒ سے وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "تم میں سے کوئی یوں نہ کہے کہ جو کچھ اللہ نے چاہا اور فلاں نے چاہا بلکہ یوں کہو کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی مرضی پھر بعد میں کسی دوسرے کی مرضی (یعنی پہلے اللہ تعالیٰ ہی کسی شئے کا ارادہ فرماتے ہیں پھر اُسے اپنے نیک بندہ کی زبان پر جاری کر دیتے ہیں۔ واللہ اعلم)

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔ جناب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس ادب کی تعلیم دی کہ وہ اللہ تعالےٰ کے ارادہ کو ——————

ہر دوسرے کے ارادہ پر مقدم سمجھیں اور یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ اور غیر کے ارادہ کے درمیان "ثم" کا لفظ استعمال کیا۔ (تقو لُوا ماشاء اللہ ثم شاء فلان) اور قواعد کی رُو سے "ثم" کا لفظ ترتیب اور پہلے اور دوسرے کے درمیان کچھ دُوری کے لیے آتا ہے۔ بخلاف واؤ عطف کے کہ وہ اشتراک کے لیے آتا ہے۔ لفظ "واؤ" اور "ثم" کے معانی کے واضح فرق کی مثال ایک دوسری حدیث ہے۔ ایک خطیب نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خطبہ دیا۔ اس نے کہا۔

مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَّعْصِهِمَا ۔

جس نے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی وہ ہدایت پا گیا اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی۔

جب اس نے آخری الفاظ مَنْ يَّعْصِهِمَا کہے تو آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تُو قوم کا بُرا خطیب ہے کھڑے ہو جاؤ" یا آپؐ نے فرمایا چلے جاؤ۔ حضرت ابو سلیمانؒ کہتے ہیں۔ جناب صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے اس لیے ناپسند فرمایا کہ اس میں اللہ تعالےٰ اور جناب صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو حرف کنایہ (ہما) کے ساتھ جمع کیا اور اس (ضمیر ہُما) کے استعمال سے اللہ اور رسولؐ میں برابری کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ (جسے جناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا۔ جبکہ

واو عطف سے ایسا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم)

اور حضرت ابوسلیمانؒ کا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ ایک دوسری حدیث صحیح میں آتا ہے کہ اس خطیب نے یوں کہا تھا۔ ومن یعصہما فقد غوی (اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ بھٹک گیا) اور لفظ یعصہما پر وقف ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔

اسی طرح کچھ مفسرین حضرات اور اصحاب المعانیؒ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد — ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی (یقیناً اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے جناب صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں)

میں اختلاف کیا ہے کہ آیا لفظ "یصلون" کا اطلاق اللہ تعالیٰ اور فرشتے دونوں پر ہے یا نہیں تو بعض حضرات نے اس کا اطلاق اللہ اور اس کے فرشتے دونوں پر جائز سمجھا اور بعض نے منع کر دیا، کیونکہ اس طرح (اگر ضمیر یُصَلّون کا مرجع اللہ اور فرشتے دونوں قرار دیے جائیں تو اللہ اور فرشتوں کے درمیان) برابری (تشریک) پیدا ہوتی ہے۔ اور ضمیر "یصلون" کو فرشتوں کے لیے خاص کر دیا گیا اور آیت کی تقدیر عبارت یوں کی ان اللہ یصلی وملٰئکتہ یصلون (یقیناً اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمتِ کاملہ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے درود)

حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی) اور اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

قل ان کنتم تحبون اللہ	کہہ دیجیے اے نبیؐ۔ اے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ
فاتبعونی یحببکم اللہ۔	سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت کرو اس طرح
(آل عمران)	اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اور یہی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو کافر کہنے لگے یہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہتے ہیں کہ ہم انہیں معبود بنالیں۔ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنا لیا تھا۔" پھر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا۔ قل أطیعوا اللہ والرسول (کہہ دیجیے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو۔ یہاں کفار کو تکلیف

دینے اور انکی ناک خاک میں ملانے کے لیے اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ملادیا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کفار پر واضح کردینا چاہتے کہ وہ کس غلط فہمی کا شکار ہیں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت تو اللہ تعالےٰ کی اطاعت ہے۔

پانچویں آیت

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ط

اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تُو نے انعام کیا۔

مفسّرینؒ نے ام الکتاب (سورۃ فاتحہ) کی اس آیت میں بھی مختلف توجیہات نقل کی ہیں۔

(۱) حضرت ابوالعالیہؒ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ یہاں "صراط المستقیم" آپ صلے اللہ علیہ وسلم آپکے نیک اہل بیت اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی راہ ہے۔" یہ مفہوم حضرت حسن بصریؒ اور حضرت ابوالعالیہؒ سے ابوالحسن ماردیؒ نے بیان کیا ہے اور ان سے ایسے ہی حضرت مکیؒ نے حکایت کیا ہے۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ یہاں "سیدھی راہ" سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا مبارک طریقہ مراد ہے۔

(۳) علامہ سمرقندیؒ نے اسی کی مانند حضرت ابوالعالیہؒ کا قول اللہ تعالےٰ کے فرمان۔ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کی تشریح میں حکایت کیا ہے۔

جب ابوالعالیہؒ کا یہ قول حضرت حسن بصریؒ نے سنا تو کہنے لگے۔ انہوں نے سچ کہا اور اللہ کی قسم! بھلائی کی بات کہی۔" اس مذکورہ تفسیر کو حضرت ماوردیؒ نے "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کی تشریح میں ابوعبدالرحمٰن بن زیدؒ سے نقل کیا ہے۔

چھٹی آیت۔ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى۔

(۱) اس آیت کی تفسیر میں ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ نے بعض مفسرینؒ سے نقل کیا ہے کہ یہاں "العُروۃ الوثقیٰ" سے جناب نبی اکرمؐ کی ذات پاک مراد ہے۔ (۲) یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے "اسلام" مراد ہے۔ (۳) بعض نے کہا اللہ کی وحدانیت کی گواہی دینا مراد ہے۔

ساتویں آیت اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار کرنے لگو تو ان کا احصا

نہ کرسکو۔ حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں۔ "یہاں نعمت سے جناب صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں"۔

آٹھویں آیت وَالَّذِیْ جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

(۱) بعض مفسرینؒ کے نزدیک یہاں "اَلَّذِیْ جَاءَ بِالصِّدْقِ" سے جناب صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ (۲) بعض قراء نے اس آیت کے اگلے جملہ کو وَهُوَ الَّذِیْ صدق بہٖ پڑھا۔ یعنی صدق کو تخفیف کے ساتھ پڑھا۔ (۳) صَدَّقَ بِهٖ سے مؤمنین مراد لیے گئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے ان اقوال کے علاوہ اور کچھ بھی اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

نویں آیت اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ حضرت مجاہد تابعیؒ فرماتے ہیں۔ "یہاں ذکر اللہ" سے جناب صلے اللہ علیہ وسلم مراد ہیں (یعنی آپ کی ذات باعثِ اطمینانِ قلب ہیں واللہ اعلم)

جامعہ اشرفیہ پشاور کا ترجمان

ہفت روزہ

صدائے اسلام

علمی، ادبی اور مذہبی مضامین کا مرقع • ملّی و ملکی مسائل کا اسلامی حل پیش کرنے والا • اسلامی نظامِ تعلیم اور اتحادِ عالمِ اسلام کا داعی • لادینیت کا پوسٹ مارٹم کرنے والا۔

قیمت: فی پرچہ ۲۵ پیسے؛ سالانہ دس روپے

منیجر ہفت روزہ صدائے اسلام، جامعہ اشرفیہ۔ پشاور

— گذارش —

شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد رسول خان صاحبؒ کے نواسے مولانا شفیق الرحمٰن صاحب حضرتؒ کے حالات قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت کے تلامذہ اور متعلقین سے گذارش ہے کہ وہ حضرت کے بارے میں جو کچھ جانتے ہوں انہیں اس پتہ پر مطلع فرمائیں۔

مولانا شفیق الرحمٰن۔ جامعہ اشرفیہ فیروزپور روڈ لاہور

دُعاء کی درخواست

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب دین پوری مدظلہٗ کے والد ماجد ایک عرصہ سے علیل ہیں۔ قارئینِ کرام سے گذارش ہے کہ ان کی تندرستی کے لیے دُعا فرمائیں —

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے

ابلیس کے دوست اور دشمن

مولانا محمد یوسف فیروزپوری،
مدرسہ تعلیم القرآن - نواں جنڈانوالہ

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اَنَّہٗ
قَالَ قَالَ رسول اللہ صلی اللہ
عَلَیہِ وسلم ذَاتَ یَوْمٍ لِاِبْلِیْس
عَلَیہِ اللَّعنۃ کَمْ اَحِبَّاؤُکَ مِنْ
اُمَّتِیْ قَالَ عَشْرُ نَفَرٍ اَوَّلُھُمْ
اَلْاِمَامُ الجَائِرُ۔ وَالْمُتَکَبِّرُ وَالْغَنِیُّ
الَّذِی لَا یُبَالِیْ مِنْ اَیْنَ یَکْتَسِبُ
الْمَالَ وَفِیْ مَاذَا یُنْفِقُ وَالْعَالِمُ
الَّذِیْ صَدَّقَ الْاَمِیْرَ عَلٰی
جَوْرِہٖ وَالتَّاجِرُ الْخَائِنُ
وَالْمُحْتَکِرُ وَالزَّانِیْ وَآکِلُ
الرِّبٰوا وَالْبَخِیْلُ الَّذِیْ لَا یُبَالِیْ
مِنْ اَیْنَ یَجْمَعُ الْمَالَ وَشَارِبُ
الْخَمْرِ یُدْمِنُ عَلَیْھَا ثُمَّ
قَالَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
فَکَمْ اَعْدَاؤُکَ مِنْ اُمَّتِیْ
قَالَ عِشْرُوْنَ نَفَراً اَوَّلُھُمْ اَنْتَ

(ترجمہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ابلیس علیہ اللعنہ سے پوچھا کہ میری امت میں سے تیرے کتنے دوست ہیں؟ (ابلیس نے) کہا کہ دس شخص ہیں ظالم[1] بادشاہ اور تکبر[2] کرنے والا مال دار[3] جو یہ پرواہ نہ کرے کہ مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا اور وہ عالم[4] جو بادشاہ کے ظلم پر اس کی تصدیق کرے اور خیانت[5] کرنے والا تاجر اور مہنگائی[6] کی وجہ سے غلہ جمع کرنے والا اور زانی[7] اور سود خور[8] اور بخیل[9] جو یہ پرواہ نہ کرے کہ مال کہاں سے جمع کرتا ہے اور ہمیشہ شراب[10] پینے والا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے تیرے کتنے دشمن ہیں تو (شیطان نے) کہا بیس شخص ہیں ان میں سے تو[1] ہے اے محمد

يَا مُحَمَّدُ فَإِنِّي أُبْغِضُكَ وَلِعَالِمٍ
الْعَامِلُ بِالْعِلْمِ وَحَامِلُ الْقُرْآنِ
إِذَا عَمِلَ بِمَا فِيهِ وَالْمُؤَذِّنُ لِلّٰهِ فِي
خَمْسِ صَلَوَاتٍ وَمُحِبُّ الْفُقَرَاءِ
وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْيَتَامٰى وَذُوْ قَلْبٍ
رَحِيْمٍ وَالْمُتَوَاضِعُ لِلْحَقِّ وَ
شَابٌّ نَشَأَ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى
وَآكِلُ الْحَلَالِ وَالشَّابَّانِ
الْمُتَحَابَّانِ فِي اللّٰهِ وَالْحَرِيْصُ
عَلَى الصَّلٰوةِ فِي الْجَمَاعَةِ وَالَّذِيْ
يُصَلِّيْ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ
وَالَّذِيْ يُمْسِكُ نَفْسَهُ عَنِ
الْحَرَامِ وَالَّذِيْ يَنْصَحُ وَفِيْ
رِوَايَةٍ يَدْعُوْا لِلْإِخْوَانِ وَ
لَيْسَ فِيْ قَلْبِهٖ شَيْءٌ وَالَّذِيْ
يَكُوْنُ أَبَدًا عَلٰى وُضُوْءٍ
وَالسَّخِيُّ وَحَسَنُ الْخُلُقِ وَالْمُصَدِّقُ
رَبَّهٗ بِمَا ضَمِنَ اللّٰهُ لَهٗ
وَالْمُحْسِنُ إِلٰى مَسْتُوْرَاتِ الْأَرَامِلِ
وَالْمُسْتَعِدُّ لِلْمَوْتِ۔

(صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں تجھ کو دشمن جانتا ہوں اور
عالم[2] جو اپنے علم پر عمل کرے اور وہ حافظ قرآن[3]
جو قرآنی احکامات پر عمل کرے اور جو[4] اللہ کی رضا
کے لیے پانچوں نمازوں کی اذان دے اور فقراء،
مساکین اور یتیموں سے محبت کرنے والا اور
مہربان[6] دل والا اور اللہ تعالیٰ کے لیے[7] عاجزی کرنیوالا
اور وہ جوان[8] جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بڑا ہو
اور حلال[9] رزق کھانے والا اور وہ[10] دو نوجوان
جو اللہ تعالیٰ کیلئے محبت کرتے ہوں اور جو[11] نماز
باجماعت پر حریص ہو اور رات[12]
کو نماز پڑھنے والا جبکہ لوگ سوئے ہوئے
ہوں اور وہ حرام[13] سے دور رہنے والا ہو اور
جو خیر خواہی[14] کرتا ہو اور ایک روایت میں ہے کہ جو اپنے بھائیوں
کیلئے دعا کرتا ہو جبکہ اسکے دل میں کوئی چیز نہ ہو
اور وہ جو ہمیشہ[15] با وضو رہتا ہو اور سخی[16]
اور نیک[17] اخلاق والا اور وہ شخص[18] جو اس چیز پر
تصدیق کرے اپنے رب کی جس پر وہ ضامن ہوا ہے
اور بیوہ[19] عورتوں کے ساتھ احسان کرنے والا
اور موت[20] کی تیاری کرنے والا۔

(منبہات ابن حجر عسقلانی)